تفسیر

سورۃ

والتین

اور

والعصر

علامہ محمد انور صاحب دہلوی

ہدیہ بارگاہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

تفسیر والتّین ووالعصر

امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی

قدس اللہ سرہٗ

کی

بصیرت افروز، روح پرور تفسیر

مکتبہ رازی ۱۵ اشہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ کراچی ۱

گذارش

زیر نظر کتاب کی افادیت کا اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہو گا۔ حضرت علامہ کے بیش بہا مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ ٹیپ ریکارڈ کی شکل میں بحمداللہ محفوظ ہے۔ اس میں متعدد عنوانات پر بحث کی گئی ہے اور بڑے نادر مضامین آ گئے ہیں۔ یہ ذخیرہ حاجی محمد صدیق صاحب طبی سینٹر شاہراہ لیاقت کراچی کے پاس محفوظ ہے اور اس کی مجموعی تعداد ۲۰۰ ٹیپوں پر مشتمل ہے۔ اہل خیر اور اہل نظر حضرات جن کو دینی علوم کی اشاعت کا ذوق ہو، درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان بیش بہا مضامین کی اشاعت کا انتظام اپنے ذمے لیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔ قوم کی بڑی بدقسمتی ہو گی اگر ایسے فاضل علامہ کے افکار اور خیالات عوام الناس تک نہ پہنچ سکیں اور یہ ذخیرہ تلف ہو جائے مولانا موصوف کی حیثیت مسلمانانِ عالم کے لئے فرد واحد تھی جو اب ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ صاحب ذوق حضرات متوجہ ہوں گے اور اس عظیم اور بیش بہا علم کی قدر کریں گے۔

(ادارہ)

ہمارا مقصد

خالص علمی سطح پر دلائل و براہین کے ساتھ مخالفین اسلام کے پھیلائے ہوئے مغالطوں کا جواب دینا اور اسلامی عقائد و تعلیمات کی حقیقی روح سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

یہ کتابچہ حضرت کا خود تحریر کردہ ہے اور حضرت علامہ اس دار فانی سے رحلت پا چکے ہیں اسلئے قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ حضرت کیلئے ایصال ثواب کریں۔ (ادارہ)

روزنامہ جنگ کراچی کا تبصرہ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء

تفسیر الیوبی

حضرت علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی قدس سرہٗ اپنے عہد کی انتہائی بلند پایہ اور منفرد شخصیت تھے۔ ان کے جیسا ذی علم، فہم و روشن ضمیر شخص اور صاحب حکمت و بصیرت کسی نسل اور قوم میں صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے۔ علامہ مرحوم کے عقیدت مند اور ان کے مقام و مرتبہ سے آشنا درد مند لوگ اب امام المتکلمین کے ملفوظات و ارشادات کو منتشر صورتوں سے کتابی اوراق میں جمع کر رہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں تفسیر الیوبی کے عنوان سے سورۃ فاتحہ کی جامع تفسیر کی طباعت و اشاعت بدقت تمام ممکن ہوئی ہے۔ حضرت موصوف نے سورۃ فاتحہ کے باب میں جس فکری اور منطقی انداز بیان کو اختیار کیا ہے۔ اور ایک ایک لفظ کے معنی شرح و ربط سے اس کے وسیع مفہوم اور ارشاد الٰہی کے پس منظر میں ذہن نشین کرائے ہیں سچ تو یہ ہے کہ یہ صلاحیت خداداد ہے۔ جو خداوند تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں کو عطا فرمائی تھی۔ کوئی پڑھنے والا شخص مشکل سے یقین کر سکتا ہے کہ کوئی اہل علم اتنے ہمہ گیر موضوع پر اس گہرائی اور گیرائی سے وعظ و بیان میں یہ علمی و فکری ربط و تسلسل برقرار رکھ سکتا ہے۔ دراصل علامہ حافظ محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ارشادات ٹیپ ریکارڈرز میں محفوظ کئے گئے تھے اور کتاب کی صورت میں اب قارئین کے سامنے آئے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان نکات کا تذکرہ گنجائش نہ ہونے کے باعث تفصیل و تواتر اور ترتیب کے ساتھ یہاں نہیں کر سکتے۔ جن کا اصل لطف اور ادراک کتابی مطالعہ پر ہی منحصر ہے۔ جناب لطیف محمد نے تفسیر الیوبی کی جلد اول کی طباعت کی ذمہ داری قبول کر کے ثواب کثیر اپنی آخرت کیلئے محفوظ کیا ہے۔

تیغ و قرآن

یہ نظم ۲ مئی ۱۹۵۹ء کے جلسہ تقسیم اسناد دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہیار زیر صدارت عالیجناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (صدر پاکستان) میں پڑھی گئی۔

اسد ملتانی

چوں سیاست عقدۂ پیدا کُند
ناخنِ شمشیر آں را وا کُند
چوں فتد در رشتۂ تدبیر پیچ!
وا نسازد جز خمِ شمشیر، ہیچ
چیست دانی کارِ شمشیر و سناں
حفظِ خیر و دفعِ شر اندر جہاں
عقل کے دارد تمیزِ خیر و شر
بے خبر باشد ہم از نفع و ضرر
امتیازِ نیک و بد یا خیر و شر
نیست ممکن جُز بہ قرآن و خبر
فرق کردن در صواب و ناصواب
نیست ممکن جز بہ تعلیمِ کتاب
تیغ اگر از حکمِ قرآں سرکشد
سر بہ تخریب و فساد و شر کشد
گردنش چوں پیشِ قرآں خم شود
تیغ اگر زخمے زند مرہم شود

اہلِ حق را تیغ با قرآں بس است[1]
کہ آں علاجِ احتیاجِ ہر کس است
"این[2] دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی۔ را محور اند"
کارگر باشد ہمیں تدبیرِ ما
تابعِ قرآں شود شمشیرِ ما
قاہری از خواہشِ خود کافری است
قاہری با حکمِ حق پیغمبری است
ایں برائے ملتِ ما خوب شد
بہرہ یاب از فیضِ دو ایوب شد
آں یکے در ملکِ پاکستانِ صدر
واں دگر بر آسمانِ علم بدر
حق یکے را صاحبِ شمشیر کرد!
دیگرے را عالمِ تفسیر کرد!
اَمر ہم باشد چو شوریٰ بَینَہُم
اہلِ حق نکنند راہِ خویش گم
گر بہم سازند دو ایوبِ ما
زود تر حاصل شود مطلوبِ ما

---

[1] علامہ اقبال مرحوم [2] علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینا کی اور اس پرامن شہر کی۔

علمائے مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انجیر اور زیتون کچھ بڑھیا چیزیں نہیں ہیں پھر کیسے اللہ پاک نے ان دونوں کی قسم کھائی اس مشکل کو دور کرنے کے لئے مفسرین کے دو خیال ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ انجیر اور زیتون سے یہ دونوں مشہور چیزیں مراد ہیں اور مفسرین نے انجیر کی خوبیاں بیان کی ہیں کہ یہ دوا اور غذا ہے اور فاکھہ ہے۔ غذا سریع الھضم ہے۔

معدہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی۔ پتہ کے راستے نکل جاتا ہے۔ بلغم کو گھٹاتا ہے۔ مثانہ کی ریت کو زائل کرتا ہے بدن کو فربہ کرتا ہے۔ جگر اور تلی کے مسامات کو کھول دیتا ہے اور بہترین فاکھہ ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طباق انجیر کا ہدیہ میں پیش کیا گیا آپ نے اس میں سے نوش فرمایا اور اپنے اصحاب سے فر

کھاؤ اگر میں کہتا کہ کوئی پھل جنت سے نازل ہوا ہے تو اس کو کہتا۔ کیونکہ جنت کے پھل بے گٹھلی کے ہوتے ہیں پس اس کو کھاؤ کیونکہ یہ قاطع براسیر ہے اور نافع نقرس ہے اور علی ابن موسیٰ سے منقول ہے کہ انجیر منہ کی بو کو کھو دیتا ہے اور بال بڑھاتا ہے اور فالج سے نجات دیتا ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ بدن کے فاضل مادوں کو خارج کر دیتا ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس کا ظاہر اور باطن یکساں ہے اخروٹ جیسا نہیں کہ اس کا اوپر کا حصہ سخت چھلکا ہے اور چھوارے جیسا نہیں ہے کہ اس کے اندر گٹھلی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں سے مراد ارض مقدس کے دو پہاڑ ہیں، کیونکہ تین اور زیتون یہاں اگتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی پیدائش کی یہ جگہیں ہیں اور بعض نے کہا کہ تین، اور زیتون سے مسجد دمشق اور مسجد بیت المقدس مراد ہے۔ اور بعض نے کہا کہ تین اور زیتون سے مسجد اصحاب کہف اور مسجد ایلیا مراد ہے اور ان حضرات کا خیال ہے کہ مسجد کی قسم اس لئے کھائی کہ مسجد موضع عبادت وطاعت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ پاک نے والد اور مولود کی قسم کھائی ہے۔ تو چاہیئے کہ ہر مولود اشرف ہو حالانکہ ذریت آدم علیہ السلام میں اکثریت کفار اور فساق کی ہے۔ لہٰذا محض شرافت قسم کھانے کی علت نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ قسم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمھارے علم و شعور میں یہ بات حق ہے اور متحقق ہے اسی طرح یہ بات حق ہے یعنی جس طرح تین اور زیتون متحقق چیزیں ہیں۔ اسی طرح انسان کو ہم نے بہترین قوام سے تیار کیا ہے غور کرو۔ طور وسینین وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اور بلد امین سے مراد مکہ

مکرمہ ہے اور امین سے مراد امانتدار ہے۔ جو کوئی اس میں داخل ہوگا اس کی یہ حفاظت کرے گا۔ قول تعالیٰ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○

البتہ تحقیق ہم نے انسان کو بہترین تعدیل و تالیف سے مؤلف کیا۔ تقویم کے معنی یہ ہیں کہ شے کو ایسی حالت میں بنانا کہ جو حالت تالیف کے مناسب ہو یعنی ہم نے انسان کو بہترین قوام سے بنایا۔ مفسرین نے انسان کے بہترین ہونے کی متعدد وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسان اپنے دونوں ہاتھوں سے کھانا کھاتا ہے اور ہر جانور منہ سے کھاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاتھ لقمے کو منہ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور بغیر ذریعہ کے مقصود تک پہنچنا ذریعہ سے مقصود تک پہنچنے سے افضل ہے اور اس وقت تمام حیوانات انسان سے افضل ہو جائیں گے۔ نیز بندر بھی ہاتھ سے کھاتا ہے۔ لہٰذا محض ہاتھ سے کھانا افضلیت کا موجب نہیں ہے۔

(۲) بعض نے فرمایا کہ انسان کو نطق اور تمیز دی گئی ہے۔ نطق کی وجہ سے افضل ہے میں کہتا ہوں نطق ملائکہ حور العین اور جن کے لئے ثابت ہے نیز بعض جانوروں کے لئے بھی ثابت ہے

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا

یعنی سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات سے مسکرا کر ہنس پڑے اس سے ظاہر ہو گیا کہ صرف نطق انسان کی افضلیت کا موجب نہیں ہے۔

(۳) بعض نے فرمایا انسان کا قد سیدھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی فضیلت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ امتداد قامت درختوں میں موجود ہے۔

(۴) بعض نے فرمایا کہ انسان صورۃً حسین ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حسن صورت حور العین میں متحقق ہے محض حسن صورت موجب فضیلت نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ یوسف علیہ السلام ابراہیم خلیل اللہؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو جائیں۔

(۵) بعض نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خط وکتابت عنایت فرمائی میں کہتا ہوں کہ یہ بھی موجب افضلیت نہیں ہے کیونکہ سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا لکھ تو اگر لکھنا افضلیت کا سبب ہوتا تو قلم بھی افضل ہو جاتا۔ نیز۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خط وکتابت نہیں جانتے تھے۔

(۶) بعض نے فرمایا کہ انسان کے لئے زمین وآسمان مسخر ہیں انسان تمام کائنات میں مثل ملک یا بادشاہ کے ہے اس سے پتہ چلا کہ انسان افضل ہے میں کہتا ہوں کہ گفتگو اس بات میں ہے کہ انسان میں کیا شے اور کیا کمال ہے کہ جس کی بنا پر انسان تمام کائنات سے افضل ہے اور انسان کی بادشاہی کیا چیز ہے اور انسان کو افضل مان لینا اور وجہ افضلیت نہ معلوم ہونا بے سود ہے بعض نے کہا کہ مخلوق کی چار قسمیں ہیں ایک مخلوق تو وہ ہے جس میں صرف قوت عقل ہے نہ کہ قوت شہوانی جیسے ملائکہ دوسری وہ ہے جس میں صرف قوت شہوانی ہے نہ کہ قوت عقل جیسے جانور تیسری وہ ہے جس میں دونوں قوتیں نہیں نہیں نہ قوت عقلی نہ شہوانی جیسے نباتات جمادات چوتھی وہ مخلوق ہے جس میں دونوں قوتیں جمع ہیں جیسے انسان۔ لہٰذا انسان بوجہ جامع عقل وشہوت ہونے کے تمام کائنات سے افضل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جامع عقل و شہوت ہونا ہی باعث افضلیت نہیں ہے کیونکر قوت شہوانی یا خیر ہے یا شر۔ اگر خیر ہے تو تمام حیوانات اخیار اور بہتر ہو گئے اور اگر قوت شہوانی شر ہے تو خیر اور شر کا مجموعہ محض خیر سے بہتر اور افضل نہیں ہو سکتا اور یہ وہ دقیقہ ہے جس پر حکمار راسخین مطلع نہیں ہوئے حاصل یہ کہ عقل و شہوت کا مجموعہ شہوت کے شر ہونے کی تقدیر پر قطعاً خیر نہیں ہے اور شہوت کے خیر ہونے پر ملائیکہ اس خیر سے عاری ہوئے اور جملہ حیوانات اخیار ہو گئے غور کرو۔

بعض نے فرمایا موجود یا ازلی اور ابدی ہے یا نہ ازلی ہے نہ ابدی یا ازلی ہے ابدی نہیں یا ابدی ہے ازلی نہیں تو ازلی اور ابدی تو صرف اللہ پاک ہے اور جو نہ ازلی ہے نہ ابدی وہ یہ دنیا ہے اور جو ازلی ہے ابدی نہیں وہ محال ہے۔ اور جو ابدی ہے ازلی نہیں وہ انسان ہے اور یہی انسان کی افضلیت ہے میں کہتا ہوں کہ ابدی ہونا۔ اگر افضلیت کا موجب ہوتا تو ملائیکہ اور حور العین اور کفار جہنم سب افضل ہو جائیں گے۔ غور کیجئے۔

بعض نے فرمایا کہ روح انسانی جواہر قدسیہ میں سے ہے اس وجہ سے انسان اشرف ہے میں کہتا ہوں کہ روحانیت موجب افضلیت نہیں ہے اس لئے کہ جب روح اللہ محمد رسول اللہ صلعم سے افضل نہیں ہے تو عام روحانیت کیونکر موجب افضلیت ہو گی کیا تم نہیں دیکھتے فنا فی اللہ میں نہیں ہے اور جب کہ نماز نیند جیسی گہری بے تعلقی سے بہتر ہے تو نیند سے کم بے تعلقی سے بدرجہا بہتر ہے

تنبیہ۔ جن لوگوں کو جسمانی قرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ سب کے سب

ان حضرات باکرامات سے افضل ہیں جنھیں دن رات خداتعالیٰ سے قرب ہو۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں قیلولہ کرنا ساری رات شب بیداری
اور ذکر الٰہی سے افضل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں لذت حاصل کرنا
تمام عمر کی ریاضت اور ترکِ لذت سے بہتر بلکہ تمام عمر کے روحانی کمالات
سے افضل ہے۔ لہٰذا روحانیت کے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیئے۔ صرف اتباع
سنت لازمی ہے خواہ روحانی مقامات حاصل ہوں یا نہ ہوں۔

اور بعض نے فرمایا اشرف الموجودات اللہ تعالیٰ ہے اور جو اللہ تعالیٰ
سے قریب ہے وہ افضل ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے اقرب ہے لہٰذا
انسان افضل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ اس استدلال
کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ سے زیادہ قریب ہے اور جو اللہ سے زیادہ قریب
ہو وہ افضل ہے نتیجہ یہ نکلا کہ انسان افضل ہے۔ حالانکہ دعویٰ یہ ہے کہ صرف
انسان افضل ہے اور یہ دعویٰ اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ عند ذی
العرش مکین اللہ تعالیٰ کے نزدیک جبرئیل علیہ السلام وقار والے ہیں۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ

جن کو اس کے پاس تقرب ہے وہ اس کی عبادت کرنے سے اکڑتے
نہیں یعنی اگر تقرب الٰہی موجب افضلیت ہے تو یہ تقرب ملائکہ اور حور العین
کو بھی حاصل ہے اور اس وقت انسان کی خصوصیت نہیں رہتی۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ انسان اس لئے افضل ہے کہ انسان کو
اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور ساری کائنات کو کُنْ فَیَکُوْن سے پیدا کیا

میں کہتا ہوں کہ ان حضرات نے اپنے رب کا یہ قول نہیں سُنا
خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝
آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اس سے کہا ہو پس وہ ہو گیا یعنی انسان بھی کن فیکون سے ہی پیدا ہوا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ انسان کو عقل و فہم اور علم عنایت کیا اس وجہ سے افضل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل و فہم اور علم، ملائکہ اور حور العین وغیرہ کو بھی عطا کیا ہے۔ نیز علم موجب افضلیت نہیں ہے ورنہ خضر علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہو جائیں گے۔ جاننا چاہیئے کہ عقل کی شرافت اور روحانیت کی سعادت اور عقل و روحانیت کی فضیلت کے حکماء قائل ہیں اور متعدد طریقوں سے انھوں نے اس مضمون کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس نظریہ کو اکثر آئمہ اسلام نے اپنا لیا ہے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے سات دلیلیں عقل کی فضیلت پر بیان فرمائی ہیں۔ یعنی قوت عقلیہ اور عقلی علم قوت حسیہ اور حسی علم سے افضل ہے اور امام رازی رضی اللہ عنہٗ نے ان سات میں تیرہ اور ملا کر بیس دلیلیں کر دی ہیں۔ پہلی دلیل قوت باصرہ اپنا ادراک نہیں کر سکتی اور قوت عاقلہ اپنا ادراک کرتی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ قوت عاقلہ قوت حسیہ سے قوی ہے، میں کہتا ہوں کہ قوت عاقلہ بھی اپنا ادراک نہیں کرتی۔ آج تک عقل کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ عقل کیا چیز ہے اور عقل کا فعل یعنی تعقل کیا چیز ہے اور عقل کا آلہ کیا ہے۔ بخلاف قوت باصرہ کے وہ کم از کم اپنے آلہ یعنی آنکھ کو آئینہ میں دیکھ کر آنکھ کا یقین کر لیتی ہے۔ دوسری دلیل قوت عاقلہ مدرک کلیات ہے اور

قوت باصرہ مدرک جزئیات ہے اور مدرک کلیات مدرک جزئیات سے افضل ہے۔ لہٰذا قوت عاقلہ قوت حسیّہ سے افضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کلی جزدی سے حکایت ہے۔ یعنی کلی کا وجود ذہنی ہے اور جزی کا وجود خارجی ہے اور وجود خارجی وجود ذہنی سے افضل ہے۔ لہٰذا مدرک جزی یعنی قوت حسیہ مدرک کلی یعنی قوت عاقلہ سے افضل ہے، نیز میں کہتا ہوں کہ اگر ادراک عقلی ادراک حسیّ سے افضل ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علی نبینا وعلیہ یہ نہ کہتے کہ رب ارنی کیف تحیی الموتی۔ اے رب مجھے دکھا کس طرح تو مردوں کو زندہ کرے گا

حالانکہ ادراک عقلی ان کو حاصل تھا۔ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ صلی اللہ علی نبینا وعلیہ یہ نہ فرماتے رب ارنی انظر الیک۔ اے رب مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں اگر ادراک عقلی اشرف ہوتا تو ادراک بصری کی یہ اکابر حضرات تمنا نہ کرتے۔

نیز ادراک عقلی اگر افضل واشرف ہوتا تو تمام مومنین اصحاب رسول صلی علیہ وسلم سے افضل ہو جاتے حالانکہ اصحاب تمام مومنوں سے افضل ہیں اور انکو ادراک بصری تھا باقی تمام مومنوں کو ادراک عقلی ہے۔ نیز اگر ادراک عقلی افضل ہوگا اور ادراک عقلی اس وقت باری تعالیٰ کا ہر مومن کامل کو حاصل ہے تو دیدار باری تعالیٰ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ الغرض ادراک عقل کو قوی کہنا اور ادراک حسیّ کو ضعیف کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کو موت کا ادراک عقلی ہے اور پھانسی پر چڑھنے والے کو موت کا ادراک حسیّ ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ کون سا قوی ہے۔ ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ادراک عقلی منتج ہے اور ادراک حسیّ منتج نہیں ہے۔ اور منتج غیر منتج سے اشرف اور افضل

ہے۔ لہٰذا ادراک عقلی ادراک حسی سے افضل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انھوں نے اپنے رب کا قول لم یلد نہیں سُنا یعنی اللہ تعالیٰ منتج نہیں ہے تو چاہیئے کہ مخلوق منتج سے کمتر ہو جائے اور مخلوق منتج اللہ پاک سے افضل ہو جائے تعالی اللہ عن ذلک۔

میں فلسفیانہ طریقے پر کہتا ہوں کہ انتاج بے نتیجہ ہے اس لئے کہ دلیل سے کسی نتیجہ تک پہنچنا دلیل کے واسطے سے ہے اور حس سے محسوس تک پہنچنا بلا واسطہ ہے۔ اور ذریعہ اور وسیلے بغیر ذریعے مطلوب تک پہنچنا۔ اس سے بہتر ہے کہ بغیر واسطے بغیر وسیلے بغیر ذریعے مطلوب تک پہنچے لہٰذا قوت حسیہ بلا واسطے مطلوب تک پہنچتی ہے اور قوت عقلیہ دلیل اور قیاس کے مقدمات کے واسطے سے بے حد کاوش اور پریشانی کے بعد مطلوب تک پہنچتی ہے۔

چوتھی دلیل ادراک حسی میں کثرت کی وسعت نہیں ہے اور ادراک عقلی میں کثرت کی وسعت ہے یعنی کثیر اشیاء کا حس ادراک بلمحہ واحد نہیں کر سکتی اور عقل بلمحہ واحد کثیر کا ادراک کر لیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عقل بھی بلمحہ واحد کثیر کا ادراک نہیں کر سکتی اور عقل کثیر کا جو ادراک کرتی ہے وہ کثیر میں جو امر مشترک ہے اس کا ادراک کرتی ہے اور وہ امر مشترک شے واحد ہے اور اگر کثیر کا ادراک بلمحہ واحد عقل کر لیتی تو مقدمات کی ترتیب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یعنی تقدیم و تاخیر مقدمات میں شرط انتاج ہے اور یہ ترتیب اور تقدیم و تاخیر اس بات کی دلیل ہے کہ عقل بیک لحظہ انتاج نہیں کر سکتی کیونکہ اولاً مطالب سے مبادی کی طرف حرکت ہوتی ہے۔ پھر مبادی سے مطالب کی طرف حرکت ہوتی ہے

ہٰذا کثیرہ کا ادراک بلحاظ واحد عقل بھی نہیں کر سکتی۔ پانچویں دلیل قوت حسیہ جب قوی محسوس کا ادراک کرتی ہے تو اس وقت ضعیف محسوس کا ادراک نہیں کرتی جیسے جب تیز زوردار آواز سُنے تو اس وقت ہلکی آواز نہیں سنتی۔ اور قوت عقلیہ کو کوئی مانع نہیں ہے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ قوت عقلیہ قوی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس وقت قوت عقلیہ مبدء اوّل کا تعقل کرتی ہے تو اس وقت عقل میں دہشت اور وحشت اور حیرت پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کو کسی معقول کا تعقل نہیں ہوتا۔ غور کیجئے۔

چھٹی دلیل قوت حسیہ چالیس سال کے بعد ضعیف ہو جاتی ہے اور قوت عقلیہ چالیس سال کے بعد قوی ہو جاتی ہے اس سے پتہ چلا کہ قوت عقلیہ قوت حسیہ کی محتاج نہیں ہے لہٰذا قوت عقلیہ قوت حسیہ سے افضل ہے میں کہتا ہوں کہ قوت حسیہ چالیس سال سے قبل قوی ہوتی ہے اور قوت عقلیہ چالیس کے سال کے بعد قوی ہوتی ہے تو جس طرح قوت عقلیہ کا چالیس سال کے بعد قوی ہونا دلیل احتیاج قوت حسیہ نہیں ہے اسی طرح قوت حسیہ کا ۴۰ سال سے قبل قوی ہونا دلیل احتیاج قوت عقلیہ نہیں ہے کسی کو کسی پر تفوق نہیں ہے۔ نیز ہم نہیں تسلیم کرتے کہ ۴۰ سال کے بعد قوت عقلیہ قوی ہو جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا

وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا

یعنی تم میں سے بعض ایسی لمبی عمر کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ عمر کی زیادتی سے عقل کم ہو جاتی ہے یا جاتی رہتی ہے۔

ساتویں دلیل قوت باصرہ قرب قریب اور بعد بعید کا ادراک نہیں کرتی اور قوت عاقلہ دونوں کا ادراک کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عقل جہاں تعقل کرتی ہے وہاں امتداد ہے ہی نہیں وہاں قرب و بعد کا سوال ہی نہیں ہوتا اگر وہاں امتداد اور پھیلاؤ ہوتا اور پھر عقل قرب قریب اور بعد بعید کا ادراک کرتی تب قوت باصرہ سے قوی ہوتی۔

آٹھویں دلیل قوت حسیہ ظاہری شئے کا ادراک کرتی ہے جیسے سطح رنگ وغیرہ اور قوت عقلیہ ظاہر اور باطن دونوں کا ادراک کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قوت عقلیہ نہ ظاہر کا ادراک کرتی ہے نہ باطن کا کیونکہ اگر قوت عقلیہ ظاہر و باطن کا ادراک کر سکتی تو قوت حسیہ کی تخلیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ قوت عقلیہ تو صرف محسوسات کی صورتوں کا ادراک کرتی ہے جو درحقیقت حکایات ہیں محکی عنہ نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے جو لذت محسوس ہوتی ہے وہ کتنی اہم ہے اور اس لذت کا تعقل کتنا غیر اہم ہے۔

نویں دلیل قوت عاقلہ کا مدرک اور معقول اللہ تعالیٰ ہے۔ اور قوت باصرہ کا مدرک رنگ و شکل ہے جو نسبت اللہ تعالیٰ کو رنگ اور شکل سے ہے وہی نسبت مدرک اللہ یعنی عقل کو مدرک لون و شکل یعنی باصرہ سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قوت عاقلہ کو مخلوقات خارجیہ اور موجودات خارجیہ میں سے کسی ایک کا بھی شعور اور علم نہیں ہے۔ وہ خالق کو کیا جانے گی۔ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو کیا سمجھے گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ قوت حسیہ نے موجودات کی اشکال اور اشکال بھی حکائی نہ اصلی قوت عقلیہ کو دیں اور عقل نے کل حدوث دیکھ کر محدث

اور شکل صنعت دیکھ کر صانع کا تعقل کیا۔ یعنی عقل نے اللہ کو نہیں جانا بلکہ صفت لیجاد و احداث اور صانعت کو جانا اور فعل کو دیکھ کر فاعل کو جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فاعل کی ذات بھی جانی جائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس نے دہلی کی جامع مسجد دیکھی اس نے قطعی یہ جان لیا کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے اور وہ ایسا ہے یعنی بڑا کاریگر اور مہندس انجنیئر ہے اور اتنا جاننے سے اس کاریگر کے نہ قد و قامت کا پتہ چلتا ہے نہ شکل و صورت کا پتہ چلتا ہے نہ اس کے نسب کا پتہ چلتا ہے نہ اس کی ذات میں سے کسی شئے کا پتہ چلتا ہے سوائے اس کی تعمیری صناعی کے۔ لہٰذا عقل سوائے اس عالم کی صناعی کے اللہ تعالیٰ کے متعلق کچھ نہیں جانتی اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو عقل جان سکتی تو بعثت انبیاء علیہم السلام کی ضرورت نہ رہتی غور کیجئے۔ تنبیہ۔ عقل جو صانعیت کو جانتی ہے یہ بھی خود نہیں جانتی اور اگر خود جانتی تو تمام عقلا صانع عالم کو جان لیتے۔ یہ بھی معلم عقل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کو سکھایا ہے۔ یا انبیاء سابقین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین نے اپنی اپنی امتوں کی عقل کو سکھایا ہے۔

دسویں دلیل قوت عاقلہ تمام موجودات اور معدومات اور ماہیات کو جانتی ہے اور قوت باصرہ صرف لون اور ضو رنگ و روشنی کو جانتی ہے میں کہتا ہوں یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ قوۃ عاقلہ صرف حکایات موجودات و معدومات کو جانتی ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ انسان کی عقل جب اپنے قتل کا تصور اور تعقل کرتی ہے تو انسان قطعاً مقتول نہیں ہوتا۔ اور جب انسان کی حس اپنے قتل کو محسوس کرتی ہے تو فوراً مقتول اور مردہ ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے۔

گیارہویں دلیل قوت عاقلہ واحد کو کثیر کر دیتی ہے اور کثیر کو واحد کر دیتی ہے
مثلاً انسان ایک چیز ہے اس کو جنس اور فصل میں تقسیم کر دیتی ہے یعنی حیوان اور ناطق
میں اور حیوان اور ناطق دو چیزیں ہیں ان کو اکٹھا کر کے ایک چیز یعنی انسان بنا دیتی
ہے اور اسی طرح پھر حیوان کو اس کی جنس اور فصل میں اور ناطق کو اس کی جنس
اور فصل میں تقسیم کر کے کثیر کر دیتی ہے اور پھر ان کثرتوں کو اکٹھا کر کے واحد
بنا دیتی ہے اور یہ قوت قوت حسیّہ میں نہیں ہے یعنی قوت حسیّہ واحد کو کثیر اور
کثیر کو واحد نہیں بنا سکتی لہٰذا قوت حسیّہ کمزور ہے اور قوت عاقلہ قوی ہے۔ میں
کہتا ہوں کہ واقع میں واحد کا کثیر ہونا اور کثیر کا واحد ہونا محال ہے۔ تو اگر عقل
ایسا کرتی ہے تو قطعی یہ فعل عقل کا لغو و غلط ہے۔ اور اگر اس سے مراد ترکیب و
تحلیل ہے تو قوت حسیّہ بھی واحد کو کثیر اجزاء میں بدل دیتی ہے اور کثیر اجزاء
کو جمع کر کے واحد بنا دیتی ہے تو قوت عاقلہ کو کوئی تفوق اس عمل کے ذریعہ
نہ ہوا بلکہ قوت حسیّہ تو موجودات خارجیہ میں وحدت کو کثرت سے اور کثرت
کو وحدت سے بدل دیتی ہے۔

قوت عقلیہ تو صرف عالم حکایت میں یہ عمل کرتی ہے اور ظاہر ہے
کہ محکی عنہ حکایت سے قوی ہے جاننا چاہئے کہ ارسطو نے انسان کی تعریف
حیوانِ ناطق سے کی ہے اور یہی تعریف برابر آج تک چلی آرہی ہے۔ اور یہ
صحیح نہیں ہے کیونکہ علمائے منطق نے یہ طے کر لیا ہے کہ تعریف کو معرف سے یعنی حیوان
ناطق کو انسان سے اعرف اور اوضح ہونا چاہئے۔ حالانکہ حیوانِ ناطق کو سوائے
ارسطو و فارابی و بوعلی اور ان کے چند متبعین کے اور کوئی نہیں جانتا اور انسان کو

ہر انسان بلکہ ہر جانور جانتا ہے لہٰذا عقل کا یہ عمل جو فلاسفہ نے وضع کیا ہے بالکل غلط ہے اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

یعنی یہ صرف نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ کی اجازت کے بغیر۔

بارہویں دلیل: قوت عاقلہ کو غیر متناہی ادراکات پر قوت ہے اور قوت حسیہ کو غیر متناہی احساسات پر قوت اور قدرت نہیں ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ قوت عاقلہ قوی اور اشرف ہے میں کہتا ہوں کہ غیر متناہی سے مراد غیر متناہی بالفعل ہے تو غیر متناہی بالفعل متحقق ہی نہیں ہے۔ اور اگر غیر متناہی سے غیر متناہی بالقوۃ مراد ہے تو جس طرح قوت عاقلہ میں غیر متناہی بالقوۃ کی استعداد ہے اسی طرح قوت حسیہ میں بھی غیر متناہی بالقوۃ کی استعداد موجود ہے۔

تیرھویں دلیل: انسان قوت عاقلہ کی بدولت حقایق کے ادراک میں شریک باری تعالیٰ ہے اور قوہ حسیہ کی بدولت شریک بہائم ہے۔

پس لازمی طور پر قوۃ عاقلہ اشرف ہو گئی میں کہتا ہوں عقل مخلوق ہے اور مخلوق کسی وقت بھی خالق کی شریک نہیں ہے۔ یعنی کوئی مخلوق کسی وصف میں کسی وقت بھی خالق کی شریک نہیں ہو سکتی ایسی بات مسلمان کے زبان پر آنی بھی نہیں چاہیئے۔

چودھویں دلیل قوت عاقلہ اپنے معقول کے وجود خارجی سے غنی ہے۔ یعنی معقول کا وجود خارج میں ہو یا نہ ہو عقل کا عمل تعقل برابر رہے گا۔ اور قوت حسیہ اپنے محسوس کے باوجود خارجی کی طرف محتاج ہے اور غنی یعنی عقل محتاج یعنی حس سے اشرف ہے، میں کہتا ہوں کہ وجود خارجی کے بغیر عقل کے جملہ تعلقات اور معقولات

سب کاذب ہیں۔ یعنی معقولات اگر محسوسات کی طرف منتہی نہ ہوں تو معقولات کا وجود عقل میں بے بنیاد اور کاذب اور غلط ہے۔ لہٰذا عقل کو محسوسات سے غنی کرنا باطل ہے بلکہ قوت حسیہ محسوس کو براہ راست محسوس کرتی ہے اور عقل قوت حسیہ کے واسطے سے معقول کرتی ہے۔ عقل زیادہ محتاج ہے۔

پندرھویں دلیل: یہ موجودات خارجیہ ممکن ہیں اور ممکن فاعل کا محتاج ہے اور فاعل بغیر علم کے ایجاد نہیں کرسکتا۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ قوت عاقلہ موجودات سے مقدم ہے اور قوت حسیہ موجودات سے موخر ہے اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان موجودات کو پیدا کرنے سے قبل عاقل تھا اور اس نے اپنی عقل کے مطابق ان موجودات کو پیدا کیا تو لامحالہ عقل موجودات سے مقدم ہوگئی اور حس چونکہ موجود ہی کا احساس کرتی ہے۔ لہٰذا حس کا احساس موجودات سے موخر ہوگیا اور مقدم مؤخر سے اشرف ہے۔ لہٰذا عقل حس سے اشرف ہے۔ میں کہتا ہوں یہ استدلال غلط ہے۔ کفر اور جنون کا مجموعہ ہے۔ کفر اس لئے کہ عقل اور عاقل کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے الحاد ہے۔ اور جنون اس لئے کہ مقدم مؤخر سے اگر اشرف ہوگا جزء لا یتجزیٰ اور عناصر وافلاک اور جمادات و نباتات و حیوانات یہ سب انسان سے مقدم ہیں اور یہ سب انسان سے اشرف ہوگئے اور انسان بدترین خلائق ہوگیا۔ کیونکہ سب سے مؤخر ہے نیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام مقدم انبیاء افضل ہوگئے۔ میں متمردانہ حیثیت سے کہتا ہوں کہ اگر مقدم اشرف ہوگا تو مؤخر کی تحصیل عبث ہوگی۔ یعنی جب اول بار اشرف ہوگیا تو دوبارہ غیر اشرف کی تحصیل بے سود ہوگی۔ کیونکہ مطلوب اشرف ہے اور جب وہ پہلی مرتبہ حاصل ہوگیا تو

مؤخر کی تحصیل غیر مقصود کی تحصیل ہو گی اور یہ فعل عبث ہے بلکہ حق یہ ہے کہ مقدم ذریعہ ہے اور مؤخر مقصود ہے اور مقصود ذریعہ سے اشرف و افضل ہے غور کرو کہ اگر اس دلیل کے تمام مقدمات صحیح بھی ہوں ۔جب بھی عقل کی حس پر فضیلت لازم نہیں آتی بلکہ یہ لازم آتا ہے کہ فاعل ممکنات کا علم حس پر مقدم ہے نہ کہ انسانی قوت عقلیہ حس سے مقدم ہے بلکہ حس انسانی عقل انسانی سے مقدم ہے اور آخر سانس تک باقی ہے ۔

سولھویں دلیل ۔قوت عاقلہ آلات کی محتاج نہیں ہے ۔اور قوت حسیہ محتاج آلات ہے ۔اور غیر محتاج محتاج سے افضل ہے ۔میں کہتا ہوں کہ قوۃ عاقلہ قطعی آلات کی محتاج ہے اور قوۃ حسیہ کی محتاج ہے اور قوۃ حسیہ عقل کی محتاج نہیں ہے ۔کیونکہ قوۃ حسیہ شروع ہی سے ہوتی ہے اور عقل اس وقت نہیں ہوتی ۔

سترھویں دلیل :۔ادراک بصری شی ذی جہت کا ہوتا ہے اور ادراک عقلی شی غیر ذی جہت کا ہوتا ہے اور مدرک غیر ذی جہت مدرک ذی جہت سے اشرف ہے ۔میں کہتا ہوں ادراک بصری جہت کا ہوتا ہے اور جہت غیر ذی جہت ہے یعنی جہت جو غیر ذی جہت ہے وہ مدرک بصر ہے کیونکہ جہت مقصد حرکت ہے ۔اگر باصرہ جہت کا ادراک نہیں کرے گی تو کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گی ۔لہٰذا جس طرح عقل غیر ذی جہت کا ادراک کرتی ہے اسی طرح حس بصری بھی غیر ذی جہت کا ادراک کرتی ہے ۔اور کوئی تفوق عقل کو حس پر نہیں ہے اس کے علاوہ عقل جن غیر ذی جہت کا ادراک کرتی ہے وہ حکایات ہیں اور حس محکیات کا ادراک کرتی ہے ۔

اٹھارھویں دلیل:۔ قوۃ باصرہ پس پردہ شی کو نہیں دیکھ سکتی اور عقل پس پردہ شی کا تعقل کرتی ہے پس قوۃ عاقلہ اشرف ہوئی۔ میں کہتا ہوں قوۃ عاقلہ بھی پس پردہ شیٔ کو نہیں تعقل کرتی ہے خلاً عالم حادث ہے تو عقل ہرگز عالم میں حدوث نہیں جانتی جب حد اوسط عالم اور حدوث کے بیچ میں آئے گی۔ جب حدوث عالم جانے گی۔ اور حد اوسط تغیر ہے یعنی عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے تو عقل تغیر کے واسطے سے حدوث عالم کو جانتی ہے۔ اسی طرح قوۃ باصرہ پس پردہ شی کو جانتی ہے کہ پس پردہ شیٔ کے سامنے آئینہ رکھا اور اس آئینہ کے سامنے دوسرا آئینہ رکھا تو جو شیٔ پس پردہ ہے وہ پہلے آئینہ میں ہے اور جو پہلے آئینہ میں ہے وہ دوسرے آئینہ میں ہے لہٰذا پس پردہ شی کو قوۃ باصرہ بھی اسی عمل سے کہ جو عمل تعقل میں ہوتا ہے دیکھ لیتی ہے۔

انیسویں دلیل:۔ قوۃ عاقلہ امیر اور مخدوم ہے اور قوۃ حاسۃ خادم ہے اور مخدوم خادم سے اشرف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ قوۃ عاقلہ مخدوم ہے کیونکہ یہی تو دعویٰ ہے کہ قوۃ عاقلہ مخدوم ہے۔ اور امیر ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ بہت بڑی اکثریت کی عقول ان کی حسی خواہشات کی تابع ہیں اگر حس خادم ہوتی تو کوئی بھی عقل کے خلاف نہ کرتا ارئت من اتخذ الہہ ہواہ، فرمان خداوندی یعنی بھلا دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنالیا۔

یعنی عقل کو حس پر کوئی فوقیت نہیں ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ۔ یعنی اس قرآن

میں ان کے لئے نصیحت ہے۔ جو اہل عقل ہیں یا جو گوش وہوش سے سنتے ہیں۔

بیسویں دلیل: حس اکثر غلطی کرتی ہے کبھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک سمجھتی ہے اور عقل غلطی نہیں کرتی، میں کہتا ہوں۔ عقل اکثر وبیشتر غلطی کرتی ہے۔ تمام اساطین حکمت اور حکمار اشراقیہ اور حکمار مشائیہ سب کی عقل نے حدوث کو قدم سمجھا اور اختیار باری تعالیٰ کو ایجاب سمجھا اور حس تو شاذ و نادر ہی غلطی کرتی ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ حساب الجبر اور ہندسہ یہ سب حسی علوم ہیں اور سارا عالم ان کی حقانیت پر متفق ہے۔ بخلاف عقلی علوم کے علم طبعی اور علم الہٰی بالمعنیٰ الاعم اور علم الہٰی بالمعنیٰ الاخص ۔ اور منطق ان میں کتنی غلطیاں ہیں اور کتنے اختلافات ہیں۔ الغرض یہ جو بیس دلیلیں بیان کی گئی ہیں میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر عقل کو حس پر شرافت ہوتی تو ثواب و عقاب عقلی ہوتا۔ ور روز جزا اور حشر اجساد کی جو حسی چیز ہے ضرورت نہ رہتی کیا تو نہیں دیکھتا کہ جنت اور حور و قصور اور اکل و شرب اور تمام نعمتیں سب حسی ہیں حتیٰ کہ اصل نعمت دیدار باری تعالیٰ حسی بصری ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ط

اس دن بہت سے لوگ اپنے رب کو دیکھ کر تر و تازہ ہو جائیں گے، اسی طرح معاذ اللہ عقاب حسی ہے۔

یہ کیسی عقل شریف ہے کہ ابدی زندگی میں اس کا نام تک نہیں ہے حاصل یہ ہے کہ عقل ذریعہ ہے اور حس مقصود ہے اور مقصود بالذات مقصود بالغرض یعنی ذریعہ سے اشرف ہے اور معجزہ حسی دلیل ہے جو قطعی عقلی دلیل سے

اشرف ہے۔ یعنی کتنی ہی عقلی دلیلیں حشر اجساد پر بیان کردی جائیں۔ ان سے وہ یقین نہیں ہوسکتا جو صاحب اعجاز کے مردہ کو زندہ کرنے سے ہوتا ہے۔ سورج کی وحدت حسی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدت عقلی ہے۔ حسی وحدت کا سب کو یقین ہے اور عقلی وحدت کا بعض کو ہے اور بعض کو نہیں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر عقل حس سے افضل ہوتی تو عقل کو حس پر سے نثار نہ کیا جاتا یعنی آپریشن کے وقت بے ہوش اور بے شعور نہ کیا جاتا یعنی حسی تکلیف سے بچانے کے لئے عقل اور شعور کو زائل کیا جاتا ہے غور کرو جاننا چاہئے کہ عقل کی فضیلت کی یہ دلائل جو اوپر بیان ہوئے ہیں ہم نے ان کا رد کردیا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عقل حس سے کمتر یا مساوی ہوگی اور اشرف نہ ہوگی تو اصحاب حس یعنی تمام حیوانات ارباب عقل یعنی انسان سے افضل ہوجائیں گے حالانکہ اجماع عالم انسان کی افضلیت پر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ انسان عقل کے باعث افضل نہیں ہے کیونکہ عقل کی وجہ سے خوف اور حزن ہوتا ہے اور حس سے صرف فوری تکلیف محسوس ہوتی ہے تو اس وقت عقل موجب افضلیت انسان نہیں ہے اور عقل کے علاوہ جتنی وجوہ مفسرین نے بیان فرمائی ہیں وہ بھی موجب افضلیت انسان نہیں ہیں جیسا کہ اوپر ہم بیان کرچکے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کی افضلیت کی وجہ صرف اختیار ہے یعنی انسان کو فعل کے کرنے اور نہ کرنے دونوں پر اختیار ہے اور یہ نعمت ملائیکہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ملائیکہ اطاعت پر مجبور ہیں۔ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ دن رات بے تکان تسبیح کرتے ہیں۔ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝

اللہ کے سامنے دم تک نہیں مارتے اور اس کے اشارے پر چلتے ہیں اور انسان اطاعت ومعصیت دونوں پر مختار ہے۔ یعنی قدرت انسانی کو فعل وترک فعل دونوں طرف نسبت برابر ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے اور یہ اختیار ہی بہترین چیز ہے۔ اللہ پاک میں اختیار مطلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فعل کرنے میں کسی باعث داعی سبب علّت فائدہ مرجح علت غائی غایت کا محتاج نہیں ہے۔ انسان باعث داعی سبب علت فائدہ مرجح علت غائی کا محتاج ہے۔ یعنی جب تک مرجح فعل یا مرجح ترک فعل نہ ہوگا، انسان اپنے اختیار کو استعمال نہیں کرسکتا اور اللہ تبارک وتعالیٰ فعل یا ترک فعل میں مرجح کا محتاج نہیں ہے اور یہی معنیٰ قادر مطلق ہونے کے ہیں۔ اور انسان قادر مقید ہے جب مرجح آئے گا جب قدرت متعلق ہوگی۔

میرے نزدیک انسان کے افضل ہونے کی وجہ صرف اختیار ہے۔ انسان کو بہترین قوام سے بنانا کے معنی یہ ہیں کہ قدرت اور اختیار عنایت کیا۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ پھر انسان کو بہترین سے لوٹا کر کمترین سے کمتر کردیا اور کمتری کی وجہ یہ ہے کہ اختیار کو فعل ترک دونوں کی طرف نسبت برابر ہے اب ضروری ہے کہ کوئی مرجح ہو جو اختیار کو فعل یا ترک فعل کی طرف لائے۔ چونکہ انسان تین قوتوں سے مرکب ہے۔ عقل، غضب، شہوت اب اگر عقل یا غضب یا شہوت اختیار کو فعل کی طرف لائے گا۔ اور عقل اور غضب اور شہوت یہ تینوں اختیار سے اسفل ہیں اور کمتر ہیں تو لامحالہ انسان ارباب عقل یعنی ملائیکہ اور اصحاب غضب وشہوت یعنی حیوانات سے کمتر ہوجائیگا اور کمتری کی

وجہ یہ ہے کہ عقل وغضب وشہوت بلکہ کل کائنات کے آثار اضطراری ہیں۔ عقل صحیح تعقل کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے اور مضطر ہے۔ مثلاً تین پنجے پندرہ ہیں تو عقل پندرہ کے ادراک پر مجبور ہے۔ پیدا ہوجانے کے بعد فنا ہوجانے سے نہ پیدا ہونا بہتر ہے۔ عقل اس علم پر مجبور ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ عقل کے نزدیک کائنات کا وجود عبث ہے۔ اسی طرح غضب مدافعت مخل مطلوب پر مجبور ہے اسی طرح شہوت طلب مطلوب پر مجبور ہے۔ اسی طرح کل کائنات اپنے اپنے آثار پر مجبور ہے۔ اب اگر انسان کا اختیار ان مجبوروں کے اختیار کا تابع ہوگیا تو ساری کائنات سے کمتر ہوگیا۔

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ۔ یہ بدترین خلائق ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اختیار اضطرار سے اعلیٰ اور ارفع ہے اب اگر انسان کا اختیار کائنات میں سے کسی کی ترجیح کا تابع ہوگیا تو تمام کائنات سے بدتر ہوگیا۔ اختیار کو اضطرار کا تابع نہیں ہونا چاہیئے تھا بلکہ اس ناقص اختیار کو کامل اختیار کے تابع ہونا چاہیئے۔ کامل اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے جو کسی باعث اور مرجح کا محتاج نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ انسان کے اختیار کا مرجح ہونا چاہیئے۔ اب یہاں دو صورتیں ہیں ایک تو ارادۂ الہٰی ہے سو ارادہ الہٰی تو مرجح نہیں ہوسکتا کیونکہ ارادے سے مراد جدا نہیں ہے اور اس وقت مراد جبری ہے جو منافی اختیار ہے لہٰذا دوسری صورت اللہ تعالیٰ کے مرجح اختیار انسانی کی اللہ تعالیٰ کا امر ہے اور یہ صحیح ہے اس میں اختیار انسانی باقی رہتا ہے اور وہ امر الہٰی کیا چیز ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو انسان یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ

کا حکم براہِ راست ہو گا تو انسان مجبور ہو جائے گا۔ اور اگر انسان کے علاوہ کائنات میں سے کسی کائن کے واسطے سے ہو گا۔ جیسے ملک حجر شجر حیوان تب بھی انسان اس حکم کے ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا امر انسان یعنی نبی کے واسطے سے جب ہو گا تو انسان اقرار و انکار پر مختار رہے گا اور یہ امر ہی انسان کے اختیاری فعل کا مرجح ہو گا۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ۔ مگر جو لوگ ایمان لے آئے یعنی اس بات کو مان گئے کہ انسان کے اختیار کو ترجیح دینے والا صرف امر الٰہی ہے۔ عقل غضب شہوت نہیں ہے اور ان لوگوں نے نیک عمل کئے، نیک عمل کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے امر الٰہی کو اپنے اعمال میں مرجح ٹھیرایا اور عقل و غضب شہوت کو مرجح نہیں ٹھیرایا ان کے لئے اجر غیر مقطوع ہے یعنی کامل اور اجر غیر منقوص اور غیر مقطوع کامل کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ یہ اختیار ناقص ہے بغیر مرجح کے متعلق ہو نہیں سکتا۔

دوسرا نقص اس میں یہ ہے کہ یہ صرف بعض اعراض کے ساتھ متعلق ہوتا ہے کل اعراض و جواہر کے ساتھ متعلق نہیں ہوتا سو اگر اختیار کا مرجح یہاں امر الٰہی ہوا تو اس کا بدلہ یہ ہو گا کہ یہ اختیار کامل غیر منقوص ہو جائیگا یعنی بغیر مرجح کے محض مشیت سے ہر شے کے ساتھ متعلق ہو گا۔ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا ۔ یعنی جنت میں ہر چیز ان کی مشیت کے مطابق ہو گی اور صرف مشیت محض بغیر مرجح کے مراد میں کافی ہو گی۔ غور کرو۔ اللہ تعالیٰ کے قول، لهم اجر غیر ممنون کے متعلق میرا فہم یہیں تک پہنچا۔ جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے قول اجر غیر ممنون

پر بعض اہل الحاد نے یہ اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے لامتناہی ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

اور دوسری آیت شریف میں فرمایا ہے۔ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ۔ یعنی ہم ان کو ثواب غیر منقوص پورا دیں گے۔ اور پورا پورا دینے کے معنی اس کے ختم کرنے کے ہیں۔ لہٰذا لامتناہی اگر پوری ہو جائے تو وہ لامتناہی نہ رہی۔ اس کا جواب امام ابن حزم نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے لامتناہی نعیم جنت کے پورا کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ یعنی جب لامتناہی پوری ہو جائے گی تو وہ ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے لامتناہی نعمت کا وعدہ کیا ہے اور یہ لامتناہی لاتقفی ہے۔ لامتناہی کمی نہیں ہے یعنی نعمتیں ہوتی جائیں گی اور ختم ہوتی جائیں گی میں کہتا ہوں کہ یہ جواب صاف نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ لامتناہی کمی ہو یا لامتناہی عدد لاتقفی ہو ہر صورت میں بولو کیا کہتے ہو کہ یہ لامتناہی پوری ہو گی یا نہیں اگر پوری ہو گی تو لامتناہی نہ رہی اگر پوری نہیں ہوئی تو پورا نہ ہونا پورے کرنے کے خلاف ہو گیا۔ لہٰذا اشکال جوں کا توں باقی رہا میں کہتا ہوں کہ حق جواب یہ ہے کہ پورا کرنے کے معنی ذی امتداد چیز میں ختم کرنے اور قطع کرنے کے ہیں جیسے دس گز پورا کرنے کے معنی دس گز ختم کر دیئے، قطع کر دیئے، اور وعدہ پورا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وعدہ کے مطابق عمل ہو گا یعنی نعمتوں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ اور کبھی ختم نہ ہو گا۔ لہٰذا نعمتیں لامتناہی رہیں اور وعدہ پورا ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے۔ کہ نصاب یعنی اجر غیر منقوص کا جو وعدہ ہم نے کیا ہے وہ ہم پورا کریں گے۔ اور پورا

کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی پورا یعنی ختم نہیں ہو گا۔ غیر مکرد۔ قولہ تعالیٰ
فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۔ کون ہے جو ان بیّن دلائل کے سننے کے بعد روز جزا
کے معاملہ میں تیری تکذیب کرے گا۔ یعنی انسان کے اختیار ناقص کو اگر
کمال نصیب نہ ہو اور صرف یہ اختیار ناقص ختم ہو جائے۔ تو اختیار اضطرار کے
برابر ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ انسان اسی اختیار کی وجہ سے تمام کائنات
سے افضل ہے یعنی اگر صرف یہی زندگی ہے اور دوسری زندگی یعنی روز جزا
نہیں ہے تو انسان اختیار کا بوجھ لاد کر اس حیات کے پل کو عبور کر رہا ہے
اور بہت بڑی اکثریت حیوانات کی سبک اور بغیر اختیار کا بوجھ اٹھائے
اس حیات کے پل کو عبور کر رہی ہے تو اس وقت انسان تمام حیوانات
سے بدتر ہو گیا اور اس کا اختیار حیوانات کے اضطرار سے کم تر ہو گیا۔ لیکن
ایسا نہیں ہے۔ بلکہ انسان افضل ہے۔ تو لا بد دار افضلیت ہے اور وہی
دار الجزا ہے۔ لہٰذا ایسی بیّن دلالت کے بعد دار الجزا کا انکار تعجب
کی بات ہے۔ قولہ تعالیٰ۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ۔ کیا اللہ تعالیٰ تمام
حاکموں کا حاکم نہیں ہے یعنی جتنے بھی حکم کرنے والے ہیں اللہ ان سب
سے بڑا حاکم ہے۔ جو خطاب عاقل بالغ فعل کے ساتھ متعلق ہو اس کو
حکم کہتے ہیں۔ حاکم وہ ہے جو عاقل بالغ کو خطاب کرے اور کہے کہ یہ فعل اچھا
ہے اسے کر اور یہ فعل برا ہے اسے نہ کر حاکم کا حکم حسن و قبیح کے تابع ہوتا
ہے۔ لہٰذا حسن و قبیح حاکموں کے حکم کی معیار ہے اور قانون ہے۔ کوئی
حاکم قانون کے خلاف حکم نہیں کر سکتا اور قانون کا تابع ہے لیکن اللہ تعالیٰ

بڑا حاکم ہے۔ یعنی اس کا حکم حسن و قبیح کے تابع نہیں ہے بلکہ حسن و قبح اس کے حکم کے تابع ہیں جس شئے کو وہ کہہ دے کہ کرو مجرد اتنا کہتے ہی وہ شئے اچھی ہو گئی اور جس شئے کو وہ کہہ دے نہ کرو بس اس کے منع کرتے ہی وہ شئے بُری ہو گئی اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حسن و قبح حسین اور قبیح کی صفت ہے یعنی حسن و قبح اشیاء کو لاحق ہے اور اشیاء کا وجود محض اسکے امر کن سے ہوا ہے لہٰذا اشیاء اس کے حکم کے تابع ہیں۔ اور صفت اشیاء یعنی حسن و قبح اشیاء کے تابع ہیں اور تابع کا تابع تابع ہے۔ لہٰذا حسن و قبح امر الٰہی کے تابع ہو گیا اب اگر حکم حسن کے تابع ہو گا تو معاملہ معکوس ہو جائے گا اور نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ

یعنی اگر اشیاء اور حقائق ان کی رائے اور ان کی عقول کے تابع ہوں گی تو زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب برباد ہو جائیں گی کیونکہ امر علت حقائق ہے اگر صفت حقائق یعنی حسن و قبح علت امر ہو گی تو نظام درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ صفت درحقیقت معلول حقیقت ہے اور علت حقیقت امر ہے اور حقیقت کے معلول کا حقیقت میں تاثیر کرنا محال ہے لہٰذا اس وقت حقیقت کا تحقق ہی نہیں ہو سکے گا اور یہی معنی فساد ارض و سما کے ہیں اور اس بات کی دلیل کہ امر علت حقائق ہے یہ ہے کہ اگر ہر شئے کے لئے مادہ ہو گا یعنی وہ شئی جس سے شئے بنی ہے تو سلسلہ لا اوّل ماضی کی جانب میں چلا جائے گا۔ اور سلسلہ لا اوّل باطل ہے کیونکہ ہر مرکب بسیط پر

منتہی ہے لہٰذا مرکب کے لئے اول ہے اور وہ اول بسیط اور مفرد ہے اور مفرد کے لئے چونکہ مادہ نہیں ہوتا لہٰذا اس کا وجود بغیر مادہ کے ہوا لہٰذا وہ محض فاعل کے حکم سے عالم وجود میں آیا اور وہ حکم کن ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مفرد ازلی ہے کیوں کہ مفرد جسمانی یعنی جسم مفرد کو طول عرض عمق لازم ہے اور جب بھی جسم ہوگا طول عرض عمق ہوگا اب اگر دیگر عوارض مثلاً حرکت وسکون وغیرہ جسم کی ذات کو لازم ہوں گے تو ہر جسم متحرک بھی ہوگا۔ ساکن بھی ہوگا اور ہر رنگ کے ساتھ رنگین ہوگا اور ہر شکل کے ساتھ متشکل ہوگا اور یہ بالمشاہدہ محال ہے تو لابد یہ عوارض ذاتی نہیں ہیں بلکہ بیرونِ ذات سے یہ آئے ہیں اور بیرونِ ذات وہی وحدہٗ لاشریک کا امر ہے جس نے ہر جسم کو ہر ایک صفت کے ساتھ مخصوص کر دیا اسی طرح مفرد روحانی کو مختلف کیفیات کے ساتھ مکیف کر دیا۔ اب اگر یہ کیفیات لوازم روح ہوتی تو ہر روح ایک ہی قسم کی کیفیات سے مکیف ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے تو معلوم ہو گیا کہ یہ تکیف خارج سے آیا ہے اور خارج وہی وحدہٗ لاشریک کا امر ہے کہ جیسا چاہا مکیف کر دیا لہٰذا ثابت ہو گیا کہ حقایق کا تحقق امر الٰہی سے ہے اور محاسن وقبایح اوصاف حقایق ہیں لہٰذا وہ بدرجہ اولیٰ امر الٰہی کے تابع ہیں اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا لہٰذا احکم الحاکمین وہ ہے جو کسی ضابطہ قانون کے تابع نہ ہو اور ہر قانون معیار ضابطہ اس کا تابع ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول میں میرا فہم یہیں تک پہنچا۔ واللہ اعلم بمراد کلامہ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ

عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ٥ (پارہ الم سورۃ بقرا ول پارہ رکوع ۵)

اے بنی اسرائیل میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا تھا اور یاد کرو اس بات کو کہ میں نے تم کو تمام عالموں پر فوقیت اور فضیلت دی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل کو تمام عالموں پر فضیلت دے دی تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہو گئے انس کو۔ جواب یہ دیا گیا ہے کہ عالمین کے معنے کثیر جماعت ہے یعنی بہت سے لوگوں پر فضیلت دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ عالمین کے معنے اگر کثیر جماعت کے ہوں گے تو رب العالمین کے معنے کثیر جماعت کے رب کے ہوں گے اور یہ معنی کفر ہیں، غلط ہیں بلکہ وہ تمام اشیاء کا رب ہے صرف کثیر کا رب نہیں ہے۔ نیز لفظ عالم چونکہ علم سے مشتق ہے اس لئے عالم دلیل ہے تو ہر وہ شئے جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے وہ عالم ہے ہر ماسوی اللہ عالم ہے اور جب کہ ہر ماسوی اللہ عالم ہے تو عالم کو بعض ماسوی اللہ یعنی جماعت کثیرہ کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے۔

مفسرین کی دوسری جماعت نے فرمایا کہ تمام عالموں پر فضیلت کے معنے یہ ہیں کہ تمہارے زمانہ کے تمام عالموں پر تم کو فضیلت دی اس لئے کہ عالم کی شرط یہ ہے کہ وہ موجود ہو اور جو موجود نہ ہو وہ عالم نہیں ہے تو جس وقت بنی اسرائیل کو فضیلت دی گئی تھی۔ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے اس لئے وہ عالمین میں شامل نہیں تھے اس لئے ان پر بنی اسرائیل کی فضیلت لازم نہیں آتی، میں کہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت

فرمایا۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○ ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور ظاہر ہے کہ جس وقت آپ تشریف فرما تھے، اس وقت تمام عالم موجود نہیں تھے تو چاہیئے کہ آپ صرف اپنے زمانہ کے عالمین کے لئے رحمت ہوں اور بعد کے قیامت تک کے عالمین کے لئے رحمت نہ ہوں۔

نیز میں کہتا ہوں اگر بنی اسرائیل اپنے زمانہ کے عالمین سے افضل ہوں گے۔ اور دوسری جگہ اللہ پاک نے فرمایا۔ وَاٰتٰكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ۔ اور اے بنی اسرائیل تم کو وہ کچھ دیا جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا اور عالمین سے مراد اپنے زمانہ کے عالمین ہیں۔ اور ان کے زمانہ کے عالمین میں سے ایک عالم خضر علیہ السلام ہیں۔ حالانکہ جو کچھ خضر علیہ السلام کو دیا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی حاصل نہ تھا چہ جائیکہ بنی اسرائیل کو۔

مفسرین کی تیسری جماعت نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عالم سے مراد تمام عالم ہی ہیں لیکن کسی ایک فضیلت اور ایک کمال میں تمام عالموں پر فضیلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل کمالات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کسی ایک کمال میں بھی بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقی فضیلت حاصل نہیں ہے تو یہ کہنا کہ ایک کمال میں بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت ہے، غلط ہے اللہ پاک نے تقریباً چودہ انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا ذکر فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۔ یعنی یہ اکابر انبیاء علیہم السّلام اللہ تعالیٰ سے ہدایت یافتہ ہیں۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔ ان کی ہدایت کی پیروی کے کیا معنی ہیں جب کہ آپ ان تمام انبیاء علیہم السّلام کی شرائع کے ناسخ ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کسی ایک کمال سے مکمل ہے تو ان میں جو فرادی کمال ہیں تم ان سب کمالات کے جامع بن جاؤ۔ لہٰذا آپ کی ذاتِ مبارک تمام انبیاء علیہم السلام کے کمالات کی جامع ہے اس لئے آپؐ سے کسی کمال میں بھی کوئی فائق نہیں ہے لہٰذا یہ کہنا کہ بنی اسرائیل کسی ایک کمال میں آپ سے فائق ہیں۔ یہ غلط ہے۔ بس یہی تین قسم کی تفسیریں میرے علم میں آئی تھیں۔

میں کہتا ہوں کہ فضیلت کا سبب اور فضیلت کا ذریعہ بھی فضیلت کہلاتا ہے جیسے مال کہ وہ ذریعہ فضیلت حقیقی ہے اس لئے وہ بھی فضیلت کہلانے لگا تو اللہ پاک کے قول وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ کے معنی یہ ہیں کہ اے بنی اسرائیل میں نے تم کو دنیادی واخروی ترقی کے اتنے ذرائع اور اسباب دیئے کہ اقوام عالم میں سے کسی کو نہیں دیئے اس کے باوجود تم ترقی نہ کرسکے تو یہ فضیلت جو بنی اسرائیل کو تمام عالم پر ہے یہ حقیقی فضیلت نہیں ہے بلکہ یہ اسبابی فضیلت ہے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک باپ نے بڑے بیٹے کو لاکھ روپیہ تجارت اور کاروبار کے لئے دیئے وہ ختم کر بیٹھا اور دوسرے کو پچاس ہزار دیئے وہ بھی کچھ کما نہ سکا اور تیسرے کو دس ہزار دیئے

اس نے دس ہزار سے دس لاکھ کمالئے۔ تو باپ نے بڑے بیٹے سے کہا کہ میں نے تجھ کو کمانے کے اتنے ذرائع مہیا کئے کہ کسی اور بیٹے کے لئے نہیں کئے مگر اس کے باوجود تو کچھ کما نہ سکا۔ بلکہ سب کچھ کھو بیٹھا اور دیکھ کہ تیرے اس سب سے چھوٹے بھائی کو دس ہزار روپئے دیئے تھے اور اس نے اس سے دس لاکھ کمائے باوجودیکہ ذرائع کمائی کے تیرے لئے سب سے زیادہ مہیا کئے تھے مگر تو ان ذرائع سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ غور کرو اللہ پاک کے اس قول کے سمجھنے میں میرا فہم یہیں تک پہنچا۔

قوله جل جلاله كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (سیقول)

لوگوں کی ایک ہی جماعت تھی پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اس حالت میں کہ وہ بشارت دیتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کے ہمراہ حق کتاب بھیجی تاکہ لوگوں کے درمیان ان کے باہمی اختلافات میں حکم صادر فرماتے اور انھیں اختلاف کیا اس حق میں مگر ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی کھلی نشانیاں آجانے کے بعد باہمی بغض وعناد کی وجہ سے پھر ہدایت کی اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے مومنوں کو اس حق کی کہ جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت

کر رہی ہے کہ لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ ایک گروہ اہل حق کا تھا یا اہل باطل کا۔ اس میں کئی قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ وہ سب دین حق پر تھے اور اس کی دلیل یہ بیان فرمائی ہے قرآن شریف میں دوسری جگہ اس طرح فرمایا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۔ یعنی شروع میں لوگوں کی ایک ہی جماعت تھی پھر ان میں اختلاف ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اختلاف دور کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اگر سب شروع میں کافر ہوتے تو اس وقت انبیاء کا بھیجنا زیادہ مناسب تھا۔ بمقابلہ اختلاف کے وقت کے اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک جماعت اہل حق اور مومنوں کی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ کسی زمانہ میں بھی کوئی امت کہ جب اس پر نبی آیا مومن نہیں ہوئی۔ حاصل یہ ہے کہ یہ امت واحدہ امت ہے اور امت نذیر سے خالی نہیں ہے اور نذیر جب آیا اس کی اکثر تکذیب ہوئی اور کسی نبی کی قوم نے پورے طور پر نبی کو نہیں مانا تاکہ پوری قوم مومنوں کی ہو جاتی اور یہ کہنا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد دین حق پر تھی اور یہی امت واحدہ ہے تو یہ غلط ہے اس لئے کہ ان کا ایک بیٹا اصحاب النار میں سے تھا اور بعد میں کوئی ایسا زمانہ نہیں آیا کہ کسی نبی کی امت پوری کی پوری مومن ہوئی ہو اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد کشتی والے ایک امت تھے اور یہ سب مومن تھے کیوں کہ یہ اصحاب کشتی امت نوح علیہ السلام کا ایک ٹکڑہ اور ایک جز تھے۔ یہ جز مستقل امت نہیں تھا اور اگر اس جز کو مستقل

پوری امت واحدہ تسلیم کرلیا جائے اور پھر ان میں اختلاف ہو اور پھر بعثت
انبیاء علیہم السلام حق کتاب سے ان کے اختلافات کو دور کریں تو یہ سارا مضمون
اگلی آیت کے بالکل خلاف ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ پاک نے فرمایا۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ
الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اختلاف انبیاء اور کتاب اور بینات کے
آنے کے بعد ہوا اور تم کہتے ہو کہ اختلاف انبیاء کے آنے سے پہلے ہوا۔ پھر انبیاء اور کتب اور بینات
آئے حاصل یہ ہے کہ بولو کیا کہتے ہو اختلاف انبیاء کے آنے سے پہلے تھا یا انبیاء کے آنے
کے بعد ہوا اگر انبیاء کے آنے سے پہلے اختلاف تھا تو آیت شریف کا یہ ٹکڑا وَمَا اخْتَلَفَ
فِيهِ اس کا رد کر رہا ہے اور اگر یہ کہتے ہو کہ اختلاف انبیاء کے آنے کے بعد ہوا اور انبیاء کے
آنے سے پہلے سب امت واحدہ مومن تھی تو پھر اس وقت بعثت انبیاء
کی ضرورت باقی نہیں رہتی یعنی جب سب لوگ مومن دین حق پر تھے تو پھر
کس لئے انبیاء کو بھیجا گیا غور کرو اور بعض آئمہ عقل نے فرمایا کہ عقل سلیم سے
غلطی نہیں ہوتی غلطی جب ہوتی ہے جب خارج سے کوئی سبب غلطی کرانے
کے لئے عقل کو عارض نہ ہو جائے لہٰذا ابتداء دین حق پر ہی ہے پھر خارجی
سبب بغض و عناد کے لاحق ہونے سے غلطی ہوتی ہے اور پھر اختلاف ہو جاتا ہے
اور پھر مومن و کافر ہو جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ سلیم العقل
نبی ہو سکتا ہے اور جب آدم علیہ السلام کو جنت میں سہو و نسیان ہو گیا تو پھر
زمین پر ان کی اولاد کو بدرجہ اولیٰ سہو و نسیان ہو سکتا ہے غور کرو اور

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ ہر بچہ دین حق پر ہوتا ہے میں کہتا ہوں فرمانِ نبویؐ حق ہے مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ پہلی انسانوں کی جماعت سب کی سب مومن تھی۔ بعض نے فرمایا کہ وہ امت واحدہ ہے کہ جس سے روزِ میثاق عہد لیا تھا اور یہ سب مومن تھے میں کہتا ہوں کہ دارِ میثاق میں کہاں اختلاف ہوا اور دارِ میثاق میں کہاں اور کب انبیاء بھیجے گئے۔ جو لوگ امت واحدۃ سے وحدتِ ایمانی مراد لیتے ہیں۔ ان کے دلائل اوپر گذر چکے اور ان کا رد بھی ہم نے کر دیا۔ اب وہ دوسری جماعت کہتی ہے کہ امت واحدہ سے وحدت کفر مراد ہے یعنی سب لوگ کفر پر متحد تھے یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر امت کے لئے رسول ہے ہر قوم کے لئے ہادی وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔ نذیر ہر امت کے لئے نذیر ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ۔ اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ بعض تم میں سے کافر اور بعض مومن ہیں۔ لہٰذا کسی وقت بھی کفر پر اتحاد ثابت نہیں ہوتا۔ غور کرو۔

نیز انبیاء علیہم السلام اختلاف کو دور کرنے آئے تھے اس سے پتہ چلا کہ انبیاء کے آنے سے پہلے سب کفر پر متحد نہ تھے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ بعض نے فرمایا کہ ابتدا میں سب شریعت عقلی پر متفق تھے۔ یہ معنیٰ ہیں امت واحدہ کے پھر بعد میں انبیاء علیہم السلام آئے میں کہتا ہوں کہ شریعت عقلی اگر دین حق تھا تو بعثت انبیاء سے کیا فائدہ ہوا۔

اور اگر دین باطل تھا تو یہ غلط ہے اس لئے کہ ہر زمانہ کی امت میں انبیاء موجود تھے۔

نیز بغیر رسول کے مہذب نہیں ہو سکتے حالانکہ ایک ابن آدم اصحاب النار میں سے ہے غور کرو بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ امت واحدہ وہ امت ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھی بعد میں بغض و حسد کی وجہ سے اختلاف ہو گیا۔ پھر اس اختلاف کے بعد اللہ پاک برابر انبیاء کو بھیجتا رہا میں کہتا ہوں کہ اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اختلاف کتاب اور بینات اور انبیاء کے آنے کے بعد ہوا غرضیکہ یہ بھی قول صحیح نہیں ہے۔

نیز الناس سے معین قوم مراد یعنی خلاف ظاہر ہے۔ خلاصہ تمام مضمون کا یہ ہے کہ نہ تو سارے انسان کسی وقت مومن تھے نہ سارے کافر تھے سوائے اس کے کہ آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام صرف یہ دو شخص اولاد ہونے سے پہلے ایمان پر متحد تھے سو ان کو الناس کہنا بالکل ظاہر کے خلاف ہے ان کے بعد ان کی اولاد کے لئے کوئی زمانہ اب تک ایسا نہیں گذرا کہ جن میں سارے انسان مومن ہوں یا سارے کافر ہوں۔ ہاں بے شک قرب قیامت میں سارے کافر ہو جائیں گے اس وقت قیامت آجائیگی لہٰذا آیت کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کے معنی امت واحدہ ایمان میں یا امت واحدہ کفر میں لینا صحیح نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں امت واحدہ سے مراد معاشرہ میں واحد ہونا ہے یعنی شروع زمانہ میں تمام لوگوں کا تمام انسانوں کا معاشرہ واحد تھا مومن کی بیوی کافر اور کافر کی بیوی مومن، نبی کا بیٹا کافر

اور کافر کا بیٹا نبی مومن اور کافر سب معاشرہ میں متحد تھے اور کفر و ایمان کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ دو قومیں نہیں تھیں اور انبیاء علیہم السلام برابر آتے رہے اور معاشرہ واحد ہی رہا پھر کفر و ایمان میں جب اختلاف شدید ہوا تو اللہ پاک نے پھر انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور انھوں نے مومنوں کو خوش خبری دی اور کافروں کو ڈرایا اور ان کے ہمراہ کتاب نازل کی، تاکہ وہ اس کتاب کے ذریعہ لوگوں کے اختلافات دور کریں۔

اور جب انبیاء علیہم السلام نے کفر و ایمان کے اختلاف میں مومن اور ایمان کی کتاب اور معجزات سے تائید کی تو کافروں کو مومنوں پر حسد اور بغض ہوا اور ان بینات کے آنے کے بعد وہ مومنوں پر اپنی حقانیت ثابت نہ کر سکے بلکہ ہار گئے اور جل کر انھوں نے معاشرہ علیحدہ کر لیا اور پھر اس وقت سے دو قومیں ہو گئیں ایک مومن دوسری کافر حاصل یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں مومن کافر سب ملے جلے تھے اور ایک ہی معاشرہ ایک ہی جماعت ایک ہی قوم سب کی سب کہلاتی تھی صرف ایمان و کفر میں اختلاف تھا جب یہ اختلاف بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور معجزات بھیج کر ایمان اور حق اور مومن اور حق پرست کی تائید فرمائی اس وقت کافر پشیمان اور کھسیانہ ہوئے اور مومنوں سے جلنے لگے اور انھوں نے معجزات اور بینات آنے کے بعد اپنی قوم اور فرقہ کا علیحدہ معاشرہ کر لیا اور علیحدہ رہن سہن کر لیا، اور عالم میں دو قومیں ہو گئیں۔ ایک مومن ایک کافر، غور کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے سمجھنے میں میرا فہم یہیں تک پہنچا۔ قول جل جلالہٗ:-

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

اور اگر تم پر خدا کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے سوائے چند کے یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ چند ایسے ہیں کہ وہ خدا کے فضل و کرم کے بغیر بھی شیطان کے پیرو نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر فضل الٰہی شیطان سے بچ جائے۔ اس وقت سے بچنے کے لئے مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں فضل و کرم سے مراد قرآن اور بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ بھیجتا تو سب شیطان کے پیرو ہو جاتے سوائے چند کے کہ وہ اللہ کا کفر نہ کرتے جیسا کہ ورقہ بن نوفل وغیرہ میں کہتا ہوں کہ ایمان باللہ بغیر ایمان بالنبی کے اتباع شیطانی ہے اور اگر یہ حضرات کسی اور نبی اور آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے تھے تو یہ اللہ کے فضل و کرم سے مستثنیٰ نہیں ہوئے اور اگر نہیں رکھتے تھے تو یہ مثل براہمہ کے ہو گئے جو بالاتفاق کافر ہیں۔ یعنی براہمہ بھی صرف اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور کافر ہیں لہٰذا فضل و کرم سے مراد قرآن اور بعثت نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ فضل و کرم سے مراد غلبہ اور کامیابی ہے یعنی اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا یعنی اللہ تعالیٰ تم کو غلبہ اور کامیابی نہ دیتا یعنی تم مغلوب اور ناکام ہو جاتے تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے۔ سوائے چند کے کہ وہ ناکام ہوتے ہوئے بھی شیطان کے پیرو نہ ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آج چودہ سو برس کے بعد بھی مسلمان کافر سے مغلوب ہو کر بھی دین نہیں چھوڑتا چہ جائیکہ

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اکابر صدیقین ہیں۔ وہ شکست پاکر اور مغلوب ہو کر دین چھوڑ دیتے یہ انتہائی ان اکابر کی توہین ہے اور اس تفسیر کو اصح بیان کیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ غیر صحیح ہے بلکہ حق یہ ہے کہ فضل و کرم سے مراد عام فضل و کرم ہے اور یہ استثنا لاتبعتم میں سے نہیں ہے یعنی چند کے علاوہ تم سب شیطان کے پیرو ہوتے بلکہ یہ استثنا علیکم کے کم سے ہے یعنی چند کے علاوہ اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے۔ یعنی چند ایسے تھے کہ جن پر اللہ کا فضل و کرم نہیں تھا۔ وہ شیطان کے پیرو ہو گئے یعنی لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ ۔ چند کے علاوہ اگر تم سب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے اور یہی معنی صحیح ہیں۔ غور کرو۔

چوتھی آیت:

قولہ جل جلالہ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

اگر اللہ تعالیٰ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سنا دیتا اور اگر ان کو سنا دیتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے۔ جاننا چاہیئے کہ یہ آیت شکل اوّل پر منطبق ہے اور یہ نتیجہ دے رہی ہے کہ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان میں بھلائی جانتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے اور یہ سراسر تناقض ہے۔ نیز لو کے معنی یہ بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بھلائی نہیں جانی اور ان کو نہیں سنایا اور منہ پھیر کر نہیں بھاگے

یعنی ایمان لے آئے یعنی لو کے معنی کی تقدیر پر یہ لازم آتا ہے کہ بھلائی نہ جاننے کی تقدیر پر اور نہ سنانے کی تقدیر پر وہ ایمان لے آتے اور یہ آیت کے مفہوم کی ضد ہے اور نقیض ہے نیز یہ بات غیر معقول ہے کہ اللہ سنائے اور وہ نہ سنیں اب کون سنانے والا ہے جس کی وہ سنیں۔ الغرض یہ دقت اور دشواری لازم آتی ہے کہ علم بالخیر اور اسماع کی تقدیر پر ہدایات سے اعراض اور تولی لازم آتی ہے اور اس کا حل عموماً تفاسیر میں نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ یہ اعراض اور تولی ایمان اور ہدایت سے نہیں ہے بلکہ کفر و ضلالت سے ہے۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سنا دیتا اور اگر وہ ان کو سنا دیتا تو وہ کفر و ضلالت سے منہ پھیر کر بھاگ جاتے اور ایمان و ہدایت قبول کر لیتے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں سنایا اس لئے وہ کفر سے نہیں بھاگے حاصل یہ ہے کہ لتولوا وھم معرضون کے معنی جو مفسرین نے فرمائے ہیں اور وہ یہ کہ لتولوا وھم معرضون عن الھدایۃ۔ یہ صحیح نہیں ہیں بلکہ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ کے معنیٰ لتولوا وھم معرضون عن الضلالۃ کے ہیں تاکہ یہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں۔ غور کرو۔

قولہ جلّ جلالہٗ، وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔

اگر حقیقت اور حق اور حقائق اور واقعات ان کی رایوں کے

تابع ہو جائیں گے تو تمام آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام اشیاء تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ حق و حقیقت انسانی عقل کے تابع نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ عقل پیدا ہونے کے بعد فنا ہونا نہیں چاہتی اور کائنات پیدا ہو کر برابر فنا ہو رہی ہے لہٰذا اگر عقل کے تقاضے کے مطابق کائنات ہوتی تو اس کو ہونا ہی نہیں چاہیئے اس لئے کہ پیدا ہونے کے بعد فنا ہو جانا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ پیدا ہی نہ ہو تو کیا تو نہیں دیکھتا کہ اگر کسی کا بچہ پیدا ہو کر مر جائے تو اس کو بہت ہی رنج ہوگا لیکن اگر وہ بچہ پیدا ہی نہ ہوتا تو کچھ بھی رنج نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ پیدا ہو کر فنا ہو جانے سے بہتر یہ ہے کہ پیدا ہی نہ ہو لیکن پیدائش برابر ہو رہی ہے لہٰذا کائنات کی پیدائش اور وجود عقل کے خلاف ہو رہا ہے۔ اب اگر کائنات عقل کے تابع ہوگی۔ تو تمام کائنات کو نابود اور فاسد ہونا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ عقل کی پیدائش یعنی وہ قوت جس سے حسن و قبح میں تمیز ہو اس قوت کی پیدائش انسان کی پیدائش کے بہت بعد ہے اور انسان کی پیدائش تمام کائنات کے بعد ہے تو عقل کی پیدائش تمام کائنات سے مؤخر ہے اور پیچھے ہے اور جب کہ عقل تمام کائنات سے پیچھے ہے یعنی عرش و کرسی لوح و قلم زمین و آسمان عناصر اربعہ جمادات، نباتات، حیوانات ان سب سے پیچھے انسان کی پیدائش ہے، یعنی نوع انسان تمام انواع کائنات میں سب سے مؤخر ہے کیونکہ تمام انواع کائنات نوع انسانی میں خرچ اور صرف ہو رہے ہیں اس لئے نوع انسانی سب سے مؤخر ہو گئی اور عقل انسانی

پیدائش سے پیچھے ہے۔ یعنی فطرت میں عقل نہیں ہے کیونکہ بچہ ماں کا دودھ بھی منہ میں رکھ لیتا ہے۔ اور کنکر پتھر بھی منہ میں رکھ لیتا ہے تمیز بہت عرصہ کے بعد ہوتی ہے اور اسی قوت ممیزہ کو عقل کہتے ہیں اور جب کہ عقل تمام کائنات سے پیچھے ہے تو کیونکر تمام کائنات عقل کے تابع ہو سکتی ہے۔ اب اگر کائنات عقل کے تابع ہو گی تو عقل سے ساری کائنات پیچھے ہو جائیگی اور اس وقت سلسلۂ نظام کائنات اول بدل جائے گا۔ اور الٹ پلٹ جائے گا۔ بس یہی معنی فساد سما وارض کے ہیں۔ غور اللہ پاک کے اس قول کے سمجھنے میں میرا فہم یہیں تک پہنچا۔ (واللہ اعلم)

وَالْعَصْرِ
کی
ایمان افروز کلامی تفسیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ

سارا زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے اور ٹوٹے میں ہے کیونکہ وہ جی رہا ہے مرنے کے لئے اسے تو مرنا چاہئے تھا جینے کے لئے۔ ہاں بے شک ٹوٹے اور خسارے سے وہ لوگ نکل گئے جو مان گئے اس بات کو کہ بے شک مرنا ہی چاہئے جینے کے لئے نہ کہ جینا چاہئے مرنے کے لئے اور خسارہ اور ٹوٹے سے بچنے کے لئے صرف اس بات کو ماننا ہی کافی نہ تھا بلکہ انھوں نے اس بات پر صحیح عمل بھی کر دکھایا یعنی وہ مرگئے جینے کے لئے اور انھوں نے صرف خود ہی یہ کام نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی تاکید سے کہہ دیا کہ جیو مت مرنے کے لئے بلکہ مرجاؤ جینے کے لئے اور انھوں نے اس بات کی بھی تاکید کر دی کہ دیکھو جینے کے لئے مرنے میں بڑے بڑے مصائب اور دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس وقت ڈٹ کر ان مصائب کا مقابلہ کرنا اگر ایسا کیا تو لازمی طور پر ٹوٹے اور خسارے سے نکل گئے! غور کرنا چاہیئے کہ مہلک سے مہلک امراض میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے خطرناک صدمات میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے۔ سانپ کے کاٹنے

سے اور سمندر اور دریا اور کنویں میں گرنے سے اور اونچے پہاڑ پر سے گرنے میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے۔ پھانسی کا حکم لگنے کے بعد بھی بعض اوقات بچ جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اسباب ہلاکت کو یقینی طور پر ہلاکت لازم نہیں ہے۔ لیکن حیات کا انجام قطعی طور پر ممات ہے۔ یعنی جینے کو مرنا قطعاً لازم ہے جو جیئے گا یقینی طور پر وہ مرے گا، زمانہ کی گواہی کے یہی معنی ہیں پس جس طرح اسباب ہلاکت سے بچنے کی کوئی کوشش کرتا ہے حالانکہ اسباب ہلاکت ہلاکت کے لئے ظنی ہیں جس کا یقینی طور پر انجام ہلاکت ہے اس سے بچنا یعنی زندگی اور حیات سے بچنا اور بھاگنا یقینی طور پر مفید ہے اور خسارہ سے نکلنا ہے۔ لہٰذا مرنے کے لئے جینا خسارہ ہے اور جینے کے لئے مرنا اس خسارہ سے نکلنا ہے۔

جینے کے لئے مرنا اس کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ خودکشی عقلاً اور شرعاً ممنوع ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ وہ آپ اپنی خوشی سے ارادے سے پیدا نہیں ہوا اور نہ اپنی خوشی اور نہ اپنے ارادے سے مرتا ہے یعنی دوسرے کی خوشی سے آتا ہے اور دوسرے ہی کی خوشی سے جاتا ہے اور یہ بالکل محسوس اور مشاہدہ ہے تو لابد جس کی خوشی سے آیا اور جس کی خوشی سے گیا اسی کی خوشی سے یہاں رہنا ہے تو اگر اپنی خوشی سے رہا تو یقیناً ہلاک ہو گیا یعنی جیا مرنے کے لئے اور اس کی خوشی سے رہا تو قطعاً ہلاکت سے نکل گیا۔ یعنی مرا جینے کے لئے بس جینے کے لئے مرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس حیات کے

پل پر سے اپنی خوشی اپنی مرضی اپنے رائے سے نہ گذرے کیونکہ تمام حیوانات اپنی شہوت کے ماتحت اس حیات کے پل پر سے گذر رہے ہیں اب اگر انسان بھی اس حیات کے پل پر سے اپنی مرضی سے گزر گیا تو مثل حیوانات کے ہو گیا بلکہ اس سے بھی بدتر کیونکہ حیوانات اس پل سے نہایت ہلکے پھلکے سبک طور پہ گذر رہے ہیں اور یہ انسان پہاڑ جیسا عقل کا بوجھ سر پہ لاد کر گذر رہا ہے۔ لہٰذا انسان حیوانات سے بھی بدتر ہو گیا اور کتاب الٰہی میں اس کی تصریح ہے ا۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ حاصل یہ ہے کہ صرف اس زندگی کا گذارنا ہی مقصود ہے تو تمام حیوانات بغیر عقل کے یہ زندگی گذار رہے ہیں لیکن انسان میں عقل موجود ہے لہٰذا عقل سے زندگی گذاری جائے گی اور اس طرح گذاری جائیگی جو خلاف ہو گی اسی زندگی کے جو بغیر عقل کے گذاری جا رہی ہے اور جو زندگی بغیر عقل کے گذاری جا رہی ہے وہ زندگی ہے جو اپنی خواہش سے گذاری جا رہی ہے لہٰذا عقل سے وہ زندگی گذاری جائے گی جو اپنی خواہش سے نہ ہو بلکہ دوسرے کی خواہش سے ہو اور دوسرا وہ ہے جو لایا تھا اور لے جائے گا۔ بس جینے کے لئے مرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو زندگی میں لایا ہے اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر ہو اور اگر اس طرح زندگی بسر ہو گئی تو پھر حیوٰۃ طیبہ مل گئی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔

یعنی جس مرد عورت نے صحیح اور صالح عمل کیا اور وہ مومن ہے، ہم اس کو حیٰوۃ پاکیزہ عنایت کریں گے، حیٰوۃ پاکیزہ وہ حیات ہے جو موجب ہلاکت و ممات نہ ہو دکھ کا چھوٹ جانا بہت اچھا ہے سُکھ کا چھوٹ جانا بہت برا ہے جو لوگ سُکھ میں ہیں ان سے قطعاً سُکھ چھوٹ جائے گا۔ اور جو لوگ دکھ میں ہیں ان سے قطعاً دکھ چھوٹ جائے گا۔ لہٰذا جیومت مرنے کے لئے مرجاؤ جینے کے لئے کیا تو نہیں دیکھتا کہ مردہ تیرتا ہے زندہ ڈوبتا ہے، تیرنا ہے تو مر ڈوبنا ہے تو جیو! اللہ پاک کے اس قول میں غور کرنے کے بعد میرا فہم یہیں تک پہنچا۔ واللہ اعلم بمراد کلامہ۔

قولہ "والعصر" زمانہ کی قسم انسان ٹوٹے میں ہے۔ قسم کے معنی تشبیہ با لتحقیق کے ہیں، یعنی جس طرح تمہارے شعور میں زمانہ متحقق ہے اسی طرح انسان کا ٹوٹے میں ہونا متحقق ہے، جیسے کوئی کہے کہ اللہ کی قسم یہ بات یوں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اے سامع! تیرے خیال میں اللہ حق ہے اسی طرح یہ بات بھی حق ہے۔ یہ بات غور کرنی چاہئے کہ قسم کس جگہ کھائی جاتی ہے۔

ہدایت اور تعلیم کے تین طریقے ہیں جن کو اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ یعنی اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت سے اور موعظت حسنہ سے لوگوں کو بلا اور ان سے بہترین طریقہ سے مجادلہ کر۔ حکمت کے معنی براہین یقینیہ کے ہیں۔ یعنی جو لوگ حکماء

اور علما ہیں ان کو براہین اور دلائل یقینیہ کے ذریعہ ہدایت کر اور جو لوگ طریقہ استدلال سے واقف نہیں ہیں مگر سمجھ بوجھ رکھتے ہیں ان کو موعظۃ حسنہ سے ہدایت کر موعظۃ حسنہ مسلمات عامہ ہیں کیونکہ مسلمات عامہ وہ اصول ہیں جو فطرت انسانی نے مفاد انسانی کے پیش نظر بغیر دلیل کے تسلیم کر لیے ہیں اور نظام عالم کی بقا ان پر موقوف ہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔
فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥۔ یعنی سچے دین کی طرف اپنا منہ کر لے وہ سچا دین فطرت اللہ اور خلقۃ اللہ ہے، جس فطرت پر لوگوں کو پیدا کیا ہے اور فطرۃ اللہ ناقابل تبدیل ہے اور یہ فطرۃ اللہ دین برحق ہے اور لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں اور مسلمات عامہ کی مثالیں یہ ہیں کہ صدق اچھی چیز ہے کذب بری چیز ہے، احسان کرنا اچھا ہے اور محسن کشی بری ہے صدق کا حسن دلیل سے ثابت نہیں ہے کیونکہ حسن طبیعت کی مناسبت کا نام ہے اور کبھی کذب طبیعت کے مناسب ہوتا ہے جیسے نبی کے بچانے کے لئے کذب واجب ہو جاتا ہے اور بے گناہ کی جان بچانے کے لئے کذب واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے مفاد عامہ صدق پر موقوف ہے اس لئے عام مفاد کے پیش نظر حسن صدق تسلیم کر لیا گیا ہے اور جیسے دو نقطوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں یہ مفاد عامہ ہندسیہ کے پیش نظر تسلیم کر لیا ہے۔ یہ اگر نظری چیز ہوتی تو دلیل سے جس طرح اور اشکال ہندسیہ ثابت کی گئی ہیں۔ اسے بھی ثابت کیا جاتا اور اگر بدیہی اور ضروری ہوتی تو اس کو علوم

متعارفہ میں شامل کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں کیا گیا۔ محض مفادِ عامہ ہندسیہ کے پیش نظر ان اصول موضوعہ کو تسلیم کرلیا گیا۔ لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے رب کے رستہ کی طرف اوّلاً دلائل سے بلا پھر مسلمات عامہ موعظۃ حسنہ کے ذریعہ بلا پھر ان سے مجادلہ کر یعنی مسلمات خاصہ سے مجادلہ کر یعنی خصم کے مسلمات سے ہی خصم کا رد کر جیسے فرمایا

قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ فَاتْلُوهَا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ یعنی اگر سچے ہو تو اپنی مسلمہ کتاب توراۃ لے آؤ اور اس کو پڑھو یہ مسلمات خاصہ ہوئے بس تعلیم و ہدایت کے یہ تین ہی طریقے تھے اب بعض لوگ زیادہ عقل نہیں رکھتے تھے ان کے سمجھانے کے لئے طریقہ قسم کا اختیار کیا گیا کہ تم دلائل نہیں سمجھ سکتے تو میری قسم پر اعتماد کرو بس قسم کھانے کا یہ موقع ہے جہاں دلائل اور مواعظ کارگر نہ ہوں وہاں قسم سے لوگوں کو مطمئن کیا جاتا ہے۔ عصر کے معنی دہر اور زمانہ کے ہیں۔ یعنی جس طرح زمانہ برحق ہے اور یقینی چیز ہے اسی طرح انسان کا گھاٹے اور ٹوٹے میں ہونا برحق ہے اور یقینی ہے جو تقدم اور تاخر اور قبلیت اور بعدیت جمع نہ ہو سکے اسی کا نام زمانہ ہے متکلمین نے زمانہ کی وہمیت ثابت کی ہے یعنی زمانہ حقیقی چیز نہیں ہے بلکہ وہمی چیز ہے اور یہ ان کی غلطی ہے اگر زمانہ وہمی چیز ہوتا تو اللہ پاک اس کی قسم نہ کھاتا نیز فرمایا ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ وہ دن حق ہے اور ظاہر ہے کہ یوم اور دن زمانہ ہے اور یوم کو حق فرمایا بعض مفسرین نے عصر کی تفسیر عصر کے وقت سے کی ہے اور بعض نے نماز عصر سے کی ہے اور بعض نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی ہے۔ قولہ جلّ جلالہ، اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَفِیْ خُسْرٍ۔ بیشک انسان ٹوٹے میں ہے خسر کے معنی نقصان اور گھاٹے
اور ٹوٹے کے ہیں اور گھاٹا اور نقصان نفع کی ضد ہے یعنی انسان نفع سے
محروم اور دور ہے اور چونکہ نفع مطلوب ہے اس لئے آیت کے معنی یہ
ہوئے کہ انسان اپنے مطلوب سے بعید اور محروم ہے۔ میں بحمداللہ متفردانہ
طریقہ سے کہتا ہوں کہ انسان اپنے مطلوب سے بعید ہے اب اس لئے کہ
انسان مکلف بالاختیار ہے اور ہر مکلف بالاختیار اپنے مطلوب سے بعید
ہے اب اس بات کا ثبوت کہ انسان مکلف بالاختیار ہے۔ مکلف کے
معنی یہ ہیں کہ اس کا وجود کسی دوسری شے کے لئے ہے اور بالاختیار کے
معنی یہ ہیں کہ وہ جس شے کے لئے پیدا ہوا ہے اس شے تک اپنے اختیار
سے پہونچے، بغیر اختیار کے یعنی اضطراراً نہ پہونچے جیسے آگ کہ اس کا وجود
حرارت کے لئے ہے لیکن وہ اپنے اختیار سے حرارت تک نہیں
پہونچی ہے اس طرح انسان کا وجود جس شے کے لئے ہے اس شے
تک اس کو اپنے اختیار سے پہونچنا ہے۔ یہ معنی مکلف بالاختیار ہونے کے
ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انسان کا وجود اگر دوسری شے کے لئے نہیں
ہوگا تو یا اپنے لئے ہوگا یا اپنے لئے بھی نہیں ہوگا۔ اور یہ دونوں شقیں باطل
ہیں تو لابُد اس کا وجود دوسری شے کے لئے ہے یہ شق کہ انسان کا وجود
اپنے لئے ہے یہ اس لئے باطل ہے کہ اگر انسان کا وجود اپنے لئے ہوگا
تو اپنے میں ہوگا اور اگر اپنے میں ہوگا تو [illegible] اپنے سے ہوگا۔ یعنی اگر اس کا

وجود لذاتہ ہو گا تو فی ذاتہ ہو گا اور فی ذاتہ ہو گا تو قطعی بذاتہ ہو گا اور اس کا وجود بذاتہ ہو نہیں سکتا اس لئے کہ انسان کو زید، عمرو بکر اور تمام افراد انسانیہ کی طرف نسبت برابر ہے اب اگر انسانیت مقتضی وجود ہو گی یعنی انسان کی ذات بذاتہ وجود کی متقاضی ہو گی تو وحدۃ الوجود لازم آئے گا اور انسان صرف فرد واحد میں منحصر ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی انسانیت واحد چیز ہے اور وجود کا تقاضا کرکے صرف وجود واحد بن جائے گا۔ حالانکہ موجودات انسانیہ بکثرت ہیں۔ اس سے پتہ چل گیا کہ انسان کا وجود انسان کی ذات کا تقاضا نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ زید ہونا بکر ہونا عمر ہونا انسانی وجود ہیں۔ اب اگر انسانیت زید ہونے اور عمر ہونے اور بکر ہونے کو چاہے گی اور یہ زید ہونا اور بکر ہونا اور عمر ہونا ہی وجود ہے تو اس صورت میں انسانیت کو صرف ایک وجود اور ایک خصوصیت اور تعین لازم ہو گا۔ حالانکہ تعینات خصوصیات وجودات کثیر ہیں اس سے معلوم ہو گیا کہ انسان کا وجود انسان کی ذات سے نہیں ہے۔ یعنی خود بخود نہیں ہے جاننا چاہیئے کہ دہریت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کا وجود خود بخود ہے یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ پہلے وہ نہیں تھا پھر ہوا تو پہلا نہ ہونا اور پہلا عدم یا خالص عدم ہے جس میں وجود کی قابلیت ہی نہیں ہے یا ایسا عدم ہے کہ جس میں وجود کی قابلیت ہے تو خالص عدم تو وجود ہو نہیں سکتا ورنہ اجتماع النقیضین لازم آئے گا اور اجتماع وجود و عدم لازم آئے گا اب رہا قابل عدم جیسا کہ نطفہ یا انڈا تو قابل مقبول کے ساتھ جمع ہو نہیں سکتا یعنی حیوان کے وقت نطفہ محال ہے مرغ کے وقت انڈا محال ہے گھی کے وقت دودھ محال ہے۔

پھر خود بخود ہونے کے کیا معنی ہیں یا تو عدم حقیقی سے وجود میں آیا یا عدم قابلی سے وجود میں آیا اور یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔ لہٰذا خود بخود ہو لبے معنی لفظ ہے لہٰذا وجود غیر سے آیا بذاتہ نہیں ہے بغیرہ ہے اور جب بذاتہ نہیں ہے تو ذات میں نہیں ہو سکتا بلکہ غیر میں ہوگا اور جب غیر میں ہوگا تو غیر کے لئے ہوگا اپنے لئے نہیں ہوگا لہٰذا انسان کا وجود انسان کے لئے نہیں ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نہ اپنے لئے ہے نہ غیر کے لئے تو یہ شق بھی غلط ہے اس لئے کہ وجود مبدار آثار کا نام ہے اب اگر اس پر اثر مرتب نہ ہوگا تو اس کا ہونا نہ ہونا ہوگا اور یہ محال ہے لہٰذا یہ کہنا کہ وجود دوسرے کے لئے بھی نہیں ہے نہ اپنے لئے تو اس صورت میں وجود اور عدم برابر ہو جائیں گے۔ جس کی تصریح کتاب الہٰی میں ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا۔ یعنی کیا تم اس خیال میں ہو کہ تمہارا وجود کسی کے لئے نہیں ہے اور تمہارا وجود مثل عدم ہے تو ایجاد لغو اور بیکار ہو جائے گی۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ اللہ جو سچا اور حق مالک ہے وہ لغویت سے برتر اور بلند ہے اور فرمایا وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ ہم نے زمین و آسمان اور اس کے مابین کو بیکار نہیں بنایا اب جب کہ یہ باطل اسما ہو گیا کہ انسان کا وجود نہ اپنے لئے ہے نہ عبث ہے تو لابد انسان کا وجود کسی دوسری شے کے لئے ہے اور یہی معنی مکلف ہونے کے ہیں لہٰذا انسان مکلف ہے یہاں ایک ضروری ہدایت ہے جب ثابت ہو گیا کہ انسان کا وجود غیر سے ہی ہے اسی دلیل سے جو اوپر گذری یعنی تمام کائنات ہو سکتی تھی اور پھر ہو گئی تو اس کا ہونا اسکے

ہو سکنے کے خلاف ہے یعنی ممکن کی طبیعت یہ ہے کہ وہ ہونے اور نہ ہونے
کے درمیان ہو اور ہونا درمیان پن کے خلاف ہے اور درمیان پن کو
توڑنے والا ہے تو تمام موجودات ممکنات کے خوارق عادات ہو گئے
کیونکہ ہونا ہو سکنے کا خارق ہے یعنی ہونے نے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان
پن کو توڑ دیا لہٰذا انبیاء علیہ السلام کے خوراق پر خوراق کائنات دلائل ہیں
بس انبیاء علیہ السلام کے خوراق پر خوراق کائنات شاہد ہیں شک کرنا کائنات
میں شک کرنا ہے۔ جاننا چاہیے کہ خرق عادت ہر صورت میں لازم ہے۔ اگر
تمام کائنات اور حوادث بلا سبب اور بلا علت ہیں جیسے کہ دہریہ کہتا ہے، جب
تمام کائنات بے سبب ہو گئی تو بعض اشیاء یعنی خوراق انبیاء علیہ السلام اگر بے
سبب ہوں تو کیا حرج ہے نیز مشاہدہ بتا رہا ہے کہ مسبب کی عادت ہے
کہ سبب ہو اور جب تمام اشیاء بے سبب ہو گئیں تو بعض کا بے سبب
ہونا کیسے غیر معقول ہے اور اگر کائنات کے لئے علت ہے تو یہ علت حادث
تو نہیں ہو سکتی کیونکہ حادث ہونے کی صورت میں یہ علت اور یہ سبب حوادث
اور کائنات میں شامل ہو جائے گا۔ لہٰذا علت قدیم ہو گی اور قدیم کی عادت
بھی قدیم ہے۔ لہٰذا جملہ حوادث قدیم کی عادت کے خلاف ہو گئے اور اگر
علت قدیمہ قادر مختار ہے تو ازل سے اس کی عادت ترک حادث یعنی
ترک فعل کی ہے اور پھر خاص معین وقت میں فعل کو حادث کرنا عادت
کے خلاف ہو گیا غرضیکہ ہر صورت میں خلاف عادت لازم ہے لہٰذا انبیاء علیہ
السلام کے خلاف عادت میں تعجب کرنا مشاہدات اور محسوسات میں شک

کرتا ہے۔ یعنی تمام محسوسات خلاف عادت ہیں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے۔!
اب جب کہ یہ ثابت ہوگیا کہ انسان مکلف ہے تو اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ تکلیف اختیاری ہے اور انسان مختار ہے مجبور نہیں ہے اور جبر کا عقیدہ غلط ہے، کیونکہ جبر کی تقدیر پر تکلیف باطل ہو جائے گی۔ یعنی مجبور کو تکلیف دینا غیر معقول ہے اور اس وقت مدح و ذم ثواب و عقاب سب باطل ہو جائیگا نیز اختیار بالمشاہدہ ہے اور بدیہی ہے حتیٰ کہ جانور بھی جانتا ہے کہ انسان مختار ہے۔ کتا پتھر کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا ہے اور ہرگز پتھر سے نہیں ڈرتا لیکن جب انسان اس پتھر کو اٹھا لیتا ہے تو اسی پتھر سے جس پر وہ نڈر بیٹھا رہتا ہے۔ ڈرنے لگتا ہے۔ اور اس کا یہ ڈرنا بتا رہا ہے کہ پتھر جبر کے ہاتھ سے نکل کر اختیار کے ہاتھ میں آگیا ہے اور یہ کہنا کہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے اور فعل عبد سے ہے۔ لہٰذا بندے کے افعال کا اللہ تعالیٰ خالق ہے اور بندہ محض مجبور ہے یہ استدلال ایسا بڑا مغالطہ ہے کہ جس میں مختار اور مجبور کہنے والے دونوں فریق مجبور ہو گئے ہیں۔ میں نے بحمداللہ اس پیچیدگی کو حل کر دیا ہے۔ جبر و اختیار کی بحث میں یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ بندے کے فعل کا مخلوق خدا ہونا بندے کے شعور میں نہیں ہے۔ جو فعل بندہ کر رہا ہے۔ بندہ کو کامل شعور ہے کہ وہ فعل بندہ ہی کر رہا ہے۔ خدا نہیں کر رہا ہے اور عقلی دلیل سے اور نصوص قرآنی سے جو جبر ثابت ہے اس جبر کا بندہ کو شعور نہیں ہے، عالم شعور سے باہر آکر مجبور ہے بھی تو وہاں مکلف نہیں ہے اور جہاں مکلف ہے وہاں مختار ہونے کا شعور ہے۔

پوری بحث دوسرے رسالہ میں ہے، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ انسان مکلف مختار ہے۔ اب اس بات کا ثبوت کہ ہر مکلف بالاختیار اپنے مطلوب سے بعید ہے اور محروم ہے یہ ہے کہ اختیار کو فعل اور ترکِ فعل دونوں کی طرف نسبت برابر ہے یعنی قوت اختیاری کو نہ فعل لازم ہے نہ ترکِ فعل لازم ہے کیونکہ اگر فعل یا ترک لازم ہوگا تو قوت اختیاری قوت اضطراری ہو جائیگی اور اس وقت مطلوب ہر صاحب اختیار کو یعنی تمام انسانوں کو حاصل ہو جائیگا اور انسان مثل حیوانات، جمادات، نباتات ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان کو اس کا مطلوب لازم نہیں ہے اور جب کہ مطلوب لازم نہیں ہے تو لابُد جدا ہے دور ہے پس مکلف بالاختیار کے اپنے مطلوب سے محروم اور بعید ہونے کے یہی معنیٰ ہیں۔ خلاصہ تقریر یہ ہے کہ:۔

انسان مکلف بالاختیار ہے اور ہر مکلف بالاختیار اپنے مطلوب سے بعید ہے لہٰذا انسان اپنے مطلوب سے بعید اور محروم ہے یہی معنیٰ انسان کے خاسر ہونے کے ہیں۔ قول جل جلالہٗ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ مگر جو لوگ ایمان لے آئے اور صالح اعمال کئے اور انہوں نے حق کی نصیحت کی اور ضبط و صبر کی وصیت کی (وہ بے شک مستثنیٰ ہیں خسارہ سے یا خسارہ کا حکم ان پر لاگو نہیں ہے)

جاننا چاہیئے کہ قوت اختیاریہ کے اعتبار سے ہر انسان ٹوٹے میں ہے جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے اب اس استثناء کے کیا معنیٰ ہیں کہ قوتِ اختیاریہ کے اعتبار سے ہر انسان ٹوٹے میں ہے جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے

اب اس استشار کے معنی یہ ہیں کہ قوت اختیاریہ کو چونکہ مطلوب اور غیر مطلوب دونوں کی طرف نسبت برابر ہے جیسے بچہ ماں کا دودھ بھی منہ میں رکھ لیتا ہے اور کنکر پتھر بھی منہ میں رکھ لیتا ہے ماں کا دودھ مطلوب ہے اور کنکر پتھر غیر مطلوب ہے لہٰذا فعل اختیار سے صادر ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اختیار کو فعل کی طرف یا ترک فعل کی طرف لانے کے لئے کوئی داعی سبب مرجح نہ ہو تو حیوانات میں تو صرف نفس یعنی شہوت و غضب کا مجموعہ مرجح فعل ہوتا ہے اب اگر انسان میں بھی مرجح فعل نفس یعنی شہوت و غضب کا مجموعہ مرجح اور داعی فعل ہو گا تو انسان مثل حیوانات ہو جائے گا چونکہ شہوت و غضب کی ترجیح اضطراری ہے یعنی بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے پر مضطر ہے تو انسان بھی جانور کی طرح مضطر اور مجبور ہو کر مثل جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا اور اختیار اضطراری دب جائے گا لہٰذا مرجح فعل نفس نہیں ہو سکتا اور عقل تنہا کافی نہیں ہے کیوں کہ فعل حرکت ہے اور حرکت غیر مجتمع الاجزاء ہے اس لئے حرکت کا انجام عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا لہٰذا انسانی اختیار کو ترجیح دینے والا یا خالق کا اختیار ہے یا خالق کا امر ہے تو خالق کا اختیار تو مرجح ہو نہیں سکتا کیونکہ خالق کے اختیار اور ارادے سے مراد جدا نہیں ہو سکتی اور اس وقت اگر خالق کا ارادہ مرجح ہو گا تو انسانی افعال اضطراری ہو جائیں گے۔ لہٰذا انسانی اختیار کو ترجیح دینے کے لئے صرف امر الٰہی کافی ہے یعنی مرجح اختیار انسانی صرف امر الٰہی ہے کیونکہ امر الٰہی صرف الٰہی جبیر ۔۔ں ہیں انسانی

اختیار باقی رہتا ہے اور یہ امر الہٰی غیر انسانی واسطے سے نہیں پہونچ سکتا کیونکہ
اس صورت میں اختیار اضطرار سے بدل جائے گا۔ یعنی فرشتہ اگر بتائے گا تو
سن کر مجبور ہو جائیگا، حیوانات، نباتات، جمادات، عناصر افلاک وغیرہ اگر
بتائیں گے تو سن کر انسان مجبور ہو جائیگا۔ لیکن اگر انسان بتائے گا تو مجبور نہیں
ہو گا بلکہ وہ مختار رہے گا اور وہی انسان جو امر الہٰی بتاو [illegible] ی نبی ہے سو
اللہ تعالیٰ کے قول الا الذین آمنو کے معنی یہ ہیں کہ جن کو [illegible] رہا کہ مرجح اختیار
انسانی صرف امر الہٰی ہے اور انھوں نے اس بات کی تصدیق [illegible] امر الہٰی
نبی کے بتائے بغیر محال ہے تو انھوں نے نبی کی بھی تصدیق کر [illegible] لے بے شک وہ
اس [illegible] ار سے نکل گئے اور عمل صالح بھی کیا عمل صالح، [illegible]
امر الہٰی [illegible] نر بہ وا [illegible] ترجیح دی۔
[illegible] نسانی اخ [illegible] جس فعل کی طرف لانے کی ترغیب [illegible] وہ
فعل عمل صالح ہے [illegible] صرف ایمان اور عمل صالح اپنے لیے نقصان سے
[illegible] فی نہیں [illegible] بلکہ دوسروں کو بھی اسی حق بات کی تصدیق کرائی
اور [illegible] کی ترغیب [illegible] اور حق کی تصدیق اور عمل صالح کی ترغیب میں
جو دشوار [illegible] انھیں خود بھی ناگوار نہ جانا اور دوسروں کو بھی گوارا کرانے
کی تاکید کی تو بے شک [illegible] نقصان سے خسران سے حرمان سے محفوظ ہو گئے

میرا یہ خیال اللہ عزوجل کے سمجھنے میں یہیں تک پہنچا۔

(واللہ اعلم بالصواب)

سوال: کیا کذب باری تعالےٰ ممکن ہے ؟
جواب: ناممکن اور محال ہے۔

ثبوت ممکن اسے کہتے ہیں کہ جس کو واقع فرض کرنے سے محال لازم نہ آئے اور کذب باری تعالیٰ کو واقع فرض کرنے سے تمام نظام دنیا وعقبیٰ اور نظام دین سب باطل ہو جاتا ہے اور تمام نظاموں کا باطل ہونا محال ہے اور یہ محال کذب باری تعالیٰ کو واقع فرض کرنے سے لازم آتا ہے لہٰذا وقوع کذب مستلزم محال ہے اور جس شے کو واقع فرض کرنے سے محال لازم آئے وہ ممکن نہیں ہے لہٰذا کذب باری تعالےٰ ممکن نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ کذب واقع کی عدم مطابقت کا نام ہے یعنی حکایت کا محکی عنہ اور واقع کے مطابق نہ ہونا اسے کذب کہتے ہیں تو امکان کذب باری تعالیٰ کے معنے یہ ہوئے کہ باری تعالیٰ کی حکایت ہو سکتا ہے کہ واقع کے مطابق نہ ہو مثلاً باری تعالیٰ نے یہ حکایت بیان کی کہ قیامت آنے والی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو امکان کذب باری تعالےٰ کی تقدیر پر یہ اعتقاد کہ ہو سکتا ہے کہ قیامت نہ آئے اور ہو سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہ ہوں یہ اعتقاد صحیح ہو حالانکہ یہ کفر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صدق وکذب • عالم مخلوق ہیں واقعات کے تابع ہیں یعنی اگر واقعات کے مطابق ہیں تو صدق کہلاتے ہیں اگر مطابق نہیں ہیں تو کذب کہلاتے ہیں لیکن تمام کائنات اور واقعات اللہ تبارک تعالیٰ کے قول کن کے تابع ہیں یہاں قول کا واقع مطابق یا غیر مطابق ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

جو کہدیا بس وہی حق ہے

قولہ الحق حق کیا چیز ہے مجرد اس کا کہنا

مثلاً عالم مخلوق میں آگ گرم ہے لیکن وہ اگر کہہ دے کہ آگ ٹھنڈی ہے تو مجرد اس کے کہتے ہی آگ ٹھنڈی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر وہ جھوٹ بولے تو مجرد اس کے بولتے ہی وہ جھوٹ سچ ہے یہاں نہ وقوع کذب ہے نہ امکان کذب، غور کر کہ ہمارے عالم عقل میں صدق و کذب واقع کے تابع ہیں مطابقت اور عدم مطابقت کے اعتبار سے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے واقع کی مطابقت نہیں ہے بلکہ جو وہ کہہ دے وہی واقع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ قضیہ صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کاذب بالامکان ہے تو قطعی اس کی نقیض باطل ہو جائے گی اور وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ صادق بالضرورۃ ہے یعنی ممکنہ کی نقیض ضروریہ ہے اور صدق و کذب قول کے اعتبار سے نقیضین ہیں یعنی صادق ہے تو کاذب نہیں کاذب ہے تو صادق نہیں صادق نہیں تو کاذب کاذب نہیں تو صادق اب اگر امکان کذب حق ہوگا تو ضرورۃ صدق قطعی باطل ہو جائے گا۔ حالانکہ ضرورۃ صدق پر سارا عالم متفق ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا یعنی اللہ تعالیٰ اصدق القول ہے صادق پر زیادتی ہوگی تب اصدق ہوگا لہٰذا یہ زیادتی درحقیقت تاکد اور ضرورۃ ہے۔ یعنی ہر صادق صادق ہوتے ہوئے ممکن الکذب ہے اور اللہ تعالیٰ صادق ہوتے ہوئے ممکن الکذب نہیں ہے یہی معنی اصدقیۃ کے ہیں غور کرو۔

سوال :۔ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے یا نہیں اگر قادر نہیں ہے تو قطعاً

عاجز ہے اور یہ صاف ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے اور اگر قادر ہے تو کذب مقدور ہو گیا حاصل سوال یہ ہے کہ بولو کیا کہتے ہو اللہ تعالےٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے یا قادر نہیں ہے اگر قادر ہے تو اس کا جھوٹ بولنا مقدور ہو گیا اور یہی معنی ممکن ہونے کے ہیں اور اگر قادر نہیں ہے تو یہی معنی اس کے عاجز ہونے کے ہیں۔

جواب :۔ جھوٹ بولنا اور سچ بولنا یہ بولنے اور کلام کی صفت ہے یعنی کلام یا جھوٹا ہو گا یا سچا ہو گا ہمارے ہاں یعنی مخلوقین میں کلام کرنا مخلوق کا فعل ہے اور مخلوق اپنے فعل کلام پر قادر ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام اللہ تبارک وتعالےٰ کا فعل نہیں ہے بلکہ اس کی صفت ہے اس لئے صفت پر قادر ہونے یا نہ ہونے کا سوال صحیح نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کذب پر قادر ہے یعنی کلام کاذب پر قادر ہے اور کلام چونکہ صفت ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت پر قادر ہے یا نہیں اس کا جواب صحیح یہ ہے کہ یہ سوال صحیح نہیں ہے تاکہ اس کا جواب دیا جائے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ ۲۰ روٹیاں ۲۰ مہمانوں میں اس طرح تقسیم کرو کہ مردوں کو دو دو عورتوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ اور بچوں کو ایک ایک مل جائے تو بتاؤ کہ کتنے مرد اور کتنی عورتیں اور کتنے بچے ہیں جب محاسب اس سوال کو سنے گا تو فوراً کہے گا کہ یہ سوال غلط ہے اس لئے کہ جب کو ایک ایک روٹی دی جائے گی جب پوری پڑے گی اور یہاں مردوں کو دو اور عورتوں کو ڈیڑھ یعنی ایک اور

آدھی زیادہ دی جا رہی ہے اس لئے یہ پوری ہی نہیں پڑیں گی لہٰذا یہ سوال صحیح نہیں ہے ہاں اگر سبھوں کو آدھی آدھی دی جائے تو یہ سوال صحیح ہو گا اور اس کا جواب یہ ہو گا کہ چار مرد ہیں ان کو ۸ روٹیاں دی گئیں اور چار عورتیں ہیں ان کو ۲ روٹیاں دی گئیں اور ۱۲ بچے ہیں ان کو چھ روٹیاں دی گئیں یعنی ۴ مرد ۴ عورتیں اور ۱۲ بچے ہیں لہٰذا یہ سوال صحیح ہو گیا اور یہ اس کا جواب بھی صحیح ہے لیکن یہ سوال کہ اللہ تعالےٰ اپنی صفت پر قادر ہے یا قادر نہیں یا یہ سوال کہ اللہ تعالےٰ اپنی ذات پر قادر ہے یا نہیں یا یہ سوال کہ اللہ تعالےٰ اپنے عدم پر قادر ہے یا نہیں یا یہ سوال کہ اللہ تعالےٰ جسم کی حرکت کے وقت سکون پر قادر ہے یا نہیں یا سلسلہ لا اول پر قادر ہے یا نہیں یا پیدا ہونے کے وقت ناپید کرنے پر قادر ہے یا نہیں یا محال پر قادر ہے یا نہیں یا واجب پر قادر ہے یا نہیں یہ سب سوال غلط ہیں غیر صحیح ہیں علماء فلاسفہ اور مشائخ اعتزال سے بے شمار غلطیاں اسی تقسیم اور تشقیق کی بدولت ہوئی ہیں اکثر علوم الٰہیہ اور اعتزالیہ میں یہی غلطی کارفرما رہی ہے یعنی نفی اور اثبات کے درمیان حصر عقلی کا ہونا یہ حصر غلط ہے اس لئے کہ پہلی تقسیم اور پہلی تشقیق کہ شی یا موجود ہے یا معدوم ہے یہ غلط ہے اور جب یہ غلط ہے تو اس کے نیچے جتنے جزئیات ہیں سب میں یہ تقسیم غلط ہو گی یعنی یہ کہنا کہ شی یا عالم ہے یا عالم نہیں ہے قادر ہے یا قادر نہیں ہے حکیم ہے یا حکیم نہیں ہے یہ سب تقسیمات موجود ہے یا موجود نہیں ہے کے تحت میں ہیں اس لئے یہ سب غیر صحیح ہیں۔